

## ترتیب

v		پیش لفظ
vii		اس کتاب کے بارے میں
<b>01-44</b>		نالہ
02	بیوہ	منشی پریم چند
<b>45-86</b>		ڈراما
46	یہودی کی اڑکی	آغا حشر کا شیری
<b>87-115</b>		کہانیاں (ترجمے)
87	کلرک کی موت (روی کہانی)	پچھے
93	جنم دن (ملیالم کہانی)	دیکوم محمد بشیر
107	جلتی جھاڑی (ہندی کہانی) (تلخیص)	نزل درما
<b>116-132</b>		الشائیعہ
117	مرحوم کی یاد میں	پھرس بخاری

## ناول

نشری اصناف میں ناول اس وقت دنیا کی مقبول ترین صنفوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ ناول دنیا بھر کی زبانوں میں لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ مختلف ادیبوں نے اپنے طور پر ناول کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن زندگی ہی کی طرح ناول کی بھی کوئی ایسی تعریف ممکن نہیں جسے مکمل یا قطعی کہا جاسکے۔ پھر بھی ناول کا اطلاق سادہ اور سلیس زبان میں لکھی گئی ایسی طویل اور بھرپور کہانی پر کیا جاسکتا ہے جس میں عام زندگی کے حالات و واقعات، مسائل و معاملات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔

روایتی ناول کے عام اجزاء ترکیبی میں پلاٹ، کردار نگاری، منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور مرکزی خیال کو شمار کیا جاتا ہے۔ ان میں پلاٹ اور کردار نگاری کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ علاوہ اس کے، ناول میں زندگی کے مشاہدے اور انسانوں کے نفسیاتی مطالعے سے بھی کچھ لکھنے والوں نے بہت کام لیا ہے۔ ہر ناول کسی نہ کسی نظریہ حیات کا حامل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ناول مصنف کے نظریہ حیات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

اردو زبان میں ناول نگاری کا آغاز انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ یہ دور دو تہذیبوں کے تصادم اور کشمکش کا دور تھا، جس پر بڑی شدت کے ساتھ انگریزی ادب کے اثرات بھی پڑ رہے تھے۔ نذیر احمد، رتن ناٹھ سرشار، عبدالحیم شرودر اور مرازا محمد ہادی روسا اردو کے اہم ترین ناول نگار کہے جاتے ہیں۔ بیسویں صدی میں اردو ناول نے بڑی ترقی کی۔ اس عہد کے ناول نگاروں میں پریم چندر، عزیز احمد، حیات اللہ الانصاری، کرشی چندر، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر، عبد اللہ حسین، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، انتظار حسین، قاضی عبد الشفار، جیلانی بانو اور جو گندر پال وغیرہ اہم ہیں۔

ناول کی صنف نے مغربی ناول، خاص طور پر انگریزی اور روی ناول سے گھرے اثرات قبول کیے ہیں۔ پہلے کچھ برسوں میں قدیم ہندوستانی فکشن کے اسالیب سے بھی بعض لکھنے والوں نے بہت روشنی حاصل کی ہے۔ چنانچہ اردو کی پرانی داستانوں، کھنقا سرست سا گر اور الف لیلہ کی روایت کا اثر بھی چند نئے ناول نگاروں کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

# منشی پریم چند

1880 ۱۹۳۶



پریم چند کی پیدائش بارس کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ ان کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ کنبے کے لوگ نواب رائے بھی کہتے تھے۔ دادا گرسہائے لال، پٹواری تھے اور والد عجائب لال ڈاک خانے میں منشی تھے۔ والدہ آندی دیوبی کے مائیکے کے لوگ بھی تعلیم یافتہ تھے۔

پریم چند کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسے میں ہوئی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد 1899 میں بارس کے قریب چنار گڑھ کے ایک مشن اسکول میں اسٹینٹ ماسٹر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ اسی زمانے میں ادب کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا۔ چنار مشن اسکول کے بعد، جولائی 1900 میں بہرائچ کے ضلع اسکول میں ماسٹر کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ اسی سال تمبر میں، فرسٹ ایڈیشنل ماسٹر کی حیثیت سے ان کا تبادلہ پرتاپ گڑھ ہو گیا۔ 1902 میں تدریس کی باقاعدہ تربیت حاصل کرنے کے لیے الہ آباد کے ٹریننگ کالج میں داخلہ لیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کی۔ اسی زمانے میں انہوں نے ہندی اور اردو اسٹیشل و رنا کیولر کا امتحان بھی پاس کیا۔ ٹریننگ کے بعد 1904 میں الہ آباد کے ایک ماذل اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ 1905 میں کان پور کے ضلع اسکول میں ماسٹر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ جون 1909 میں مہوبہ، ضلع ہمیر پور (بیوی) کے لیے تبادلہ ہو گیا اور تدریس کے بجائے اسکول کے معائنے کا کام سپرد کیا گیا۔ مہوبہ کے قیام کے دوران 1916 میں اٹھ میڈیسٹ اور 1919 میں گورکھور کے زمانہ قیام میں الہ آباد یونیورسٹی سے پرائیوریٹ طور پر بی۔ اے۔ کام امتحان پاس کیا۔ تحریک عدم تعاون کے دوران گورکھ پور کے ایک جلسہ میں مہاتما گاندھی کے ایما پر انہوں نے 1920 میں سرکاری نوکری چھوڑ کر تصنیف و تالیف کو ہی معاش کا ذریعہ بنالیا۔

پریم چند کو مضمایں لکھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ ان کی پہلی تصنیف ایک ڈراما تھا جو انہوں نے تقریباً تیرہ سال کی عمر میں لکھا تھا۔ اس کا عنوان تھا: ایک ماموں کا رومان۔ یہ ڈرامائی نہیں ہوا۔ پریم چند کے ابتدائی دور کے مضمایں اور ایک ناول بارس کے ہفتہ وار اخبار ”آوازِ خلق“ میں شائع ہوئے۔ ناول کا عنوان تھا: اسرار معابد۔ یہ اخبار کے اکتوبر 1903 سے فروری 1905 تک

کے شمارے میں قحط و ارشائے ہوا تھا۔ اس پر مصنف کا نام ”ڈھنپت رائے عرف نواب رائے الہ آبادی“ لکھا جاتا تھا۔ پریم چند کا دوسرا ناول ”ہم خرمادہم ثواب“ ہے جو غالباً 1906 میں کانپور سے فشی دیا زرائن گم نے شائع کیا تھا۔ وہ ایک ماہانہ رسالہ ”زمانہ“ بھی شائع کرتے تھے، جس میں پریم چند کے بہت سے مضامین، تبصرے اور افسانے شائع ہوئے۔ 1910 تک ان کی تصاویف نواب رائے کے نام سے چھپتی رہیں۔ پریم چند کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ”سو ز طن“، بھی نواب رائے کے نام سے شائع ہوا تھا لیکن جب حکومت کو محسوس ہوا کہ ان کہانیوں میں طن سے محبت اور آزادی حاصل کرنے کی ترغیب، پڑھنے والوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر سکتی ہے تو مجموعہ ضبط کر لیا گیا۔ مصنف سے کہا گیا کہ وہ آئندہ جو کچھ لکھے وہ ملکٹر کو دکھا کر اور اجازت لے کر چھپنے کے لیے بھیجے۔ اس پابندی کے بعد انہوں نے اپنا قلمی نام پریم چند رکھ لیا۔ رسالہ ”زمانہ“ کے دسمبر 1910 کے شمارے میں ان کی کہانی ”بڑے گھر کی بیٹی“، شائع ہوئی۔

پریم چند کے ناول ”اسرار معابر“ اور ”سو ز طن“ میں شامل کہانیوں کا یہ پہلو بہت واضح ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے سماج کی برائیوں اور انگریزی حکومت کی چال بازیوں سے عوام کو آگاہ کیا۔ اس طرح وہ اپنے معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ پریم چند کے ارادے کی وجہ ہندوستانی معاشرے میں پھیلا ہوا منتشر تھا۔

دیہات اور شہروں کی یہ حالت دیکھتے ہوئے ملک کے بڑے سیاسی رہنماؤں، خاص کر گاندھی جی کی طرح، پریم چند نے بھی محسوس کیا کہ اس بھی ان بگاڑ کی جڑ غلامی کی متی اور فضا کی وجہ سے مضبوط ہو رہی ہے۔ لہذا ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے بعد ہی یہاں کے غریب لوگ انسانوں کی طرح جی سکیں گے۔ اپنے اس احساس کو سیاسی لوگوں نے چدو جبد آزادی کا روپ دیا اور پریم چند نے اپنے اس احساس کو تحریر میں ڈھال کرنا لوں اور افسانوں کے ذریعے عوام تک پہنچایا۔

پریم چند کی سوانح پڑھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی کے جیسے جیسے دور دیکھے، انھیں کسی ذہین اور حستا شخص کی طرح اپنے دل و دماغ پر نقش کر لیا۔ ان پر غور کرنے کے بعد، یہ فیصلہ کیا کہ زندگی کی ان سچائیوں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے ناولوں، افسانوں اور مضامین سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ اپنے تجویز بول اور مشاہدوں کو عوام تک پہنچانے کے لیے، پریم چند نے بہت سادہ، سلیس اور پُر اثر زبان کا استعمال کیا۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی باتیں، پڑھنے والے کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈاتی ہیں۔ وہ اردو کے ساتھ ساتھ روز مرہ کی ہندی کے الفاظ بھی مناسب جگبؤں پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں اور افسانوں میں مقصد پرستی اور سماجی فلاج و بہبود کے احساس کے ساتھ ساتھ دل چسپ کردار اور مزایہ کردار بھی ہیں۔ پریم چند نے ان کے ذریعے زندگی کا خوش گوار بپلو پیش کیا ہے اور پڑھنے والوں پر واضح کیا ہے کہ آدمی سخت سے سخت حالات میں بھی، زندگی

سے جی گانے اور دکھوں کو برداشت کرنے کے پہلو نکال ہی لیتا ہے۔

پریم چند کے ناولوں کا ماحول اور ان کے کردار زیادہ تر دیہات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پریم چند بھی، گاندھی جی اور ٹیگور وغیرہ کی طرح، اس حقیقت سے واقف تھے کہ ہندوستان کی اصل آبادی گاؤں میں بستی ہے اور گاؤں کے باشندوں کی سادگی اور مخصوصیت ہندوستانی معاشرے کی روح کا ایک ناگزیر جزو ہے۔

آپ نے اپنی کچھلی جماعتوں میں داستان اور افسانے پڑھے ہیں۔ انھیں پڑھتے ہوئے آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ داستان کا مصنف کردار یا واقعے کا بیان کئی زاویے اختیار کرتا ہے اور بہت تفصیل سے کام لیتا ہے۔ افسانے کا مصنف، داستان لکھنے والے کے مقابلے میں، بہت اختصار کے ساتھ اور اشاروں کثایوں میں اپنی بات کہتا ہے۔ ان اشاروں کثایوں کی تہہ تک پہنچنے کے لیے پڑھنے والے کو بہت چوکتا رہنا پڑتا ہے۔ اگر اس کی نظر سے کوئی نقہ یا لفظ چوک جائے تو افسانے کے معنی خیط ہو سکتے ہیں۔ یہ صورت ناول میں نہیں ہوتی کیوں کہ اس میں کردار اور واقعات اکثر پورے پھیلاو کے ساتھ بیان ہوتے ہیں۔

ناول ”بیوہ“ کے آغاز میں دان ناتھ اور امرت رائے کی باتوں پر غور کیجیے، تو اندازہ ہو جائے گا کہ پریم چند نے تین چار صفحات میں ہی وہ خیال اپنے پڑھنے والوں پر اچھی طرح واضح کر دیا ہے، جس پر ناول کی تعمیر ہوئی ہے۔

آپ کی اس کتاب میں ناول ”بیوہ“ کے ابتدائی نواب شاہل ہیں تاکہ آپ اس صفحہ ادب سے بخوبی متعارف ہو سکیں۔ پریم چند کا ناول بہت مختصر ہے، یعنی صرف 182 صفحات کا۔ یہ چند صفحات پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ پریم چند کتنے دردمند دل کے مالک تھے۔ ان کی یہ دردمندی اور انسان دوستی ان کے تمام ناولوں میں مرکزی قوت کا درجہ رکھتی ہے۔

پریم چند نے افسانوں کی طرح اپنے ناولوں میں بھی دیہات کے ساتھ ساتھ، شہر کے مسائل کا بیان کیا ہے۔ ان کے زیادہ تر ناول ایسے ہیں کہ جو شہری اور دیہی زندگی میں بیٹھے ہوئے ہیں مگر ”گودان“ اور ”بازارِ حسن“ میں شہر اور گاؤں کیجا ہیں اور ایک دوسرے کے مقابلہ رکھے ہوئے آئینے بن گئے ہیں۔

ناول ”بیوہ“ پڑھنے سے پہلے، اگر یہ بات آپ کے ذہن میں رہے کہ خود پریم چند نے بھی اپنی دوسری شادی ایک بال بیوہ شیبورانی دیوی سے کی تھی تو آپ پریم چند کے کردار کے ایک اہم پہلو سے واقف ہو جائیں گے۔ پریم چند ادیب کے ساتھ ساتھ ایک سرگرم سماجی مصلح بھی تھے اور ادب کے ذریعے انھوں نے قومی اصلاح اور تعمیر کا یہ ابھی اٹھایا تھا۔

## بیوہ

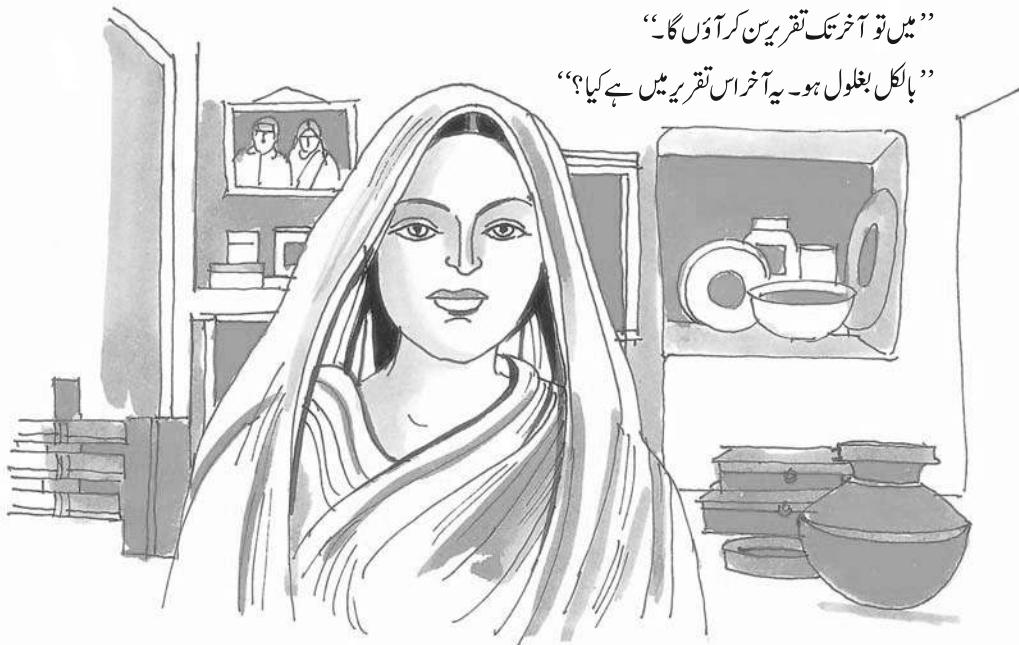
کاشی کے آریہ مندر میں پنڈت امر ناتھ کی تقریر ہو رہی ہے، ناظرین مسحور سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ پروفیسر دان ناتھ نے آگے کھک کر اپنے دوست بابا امرت رائے کے کان میں کہا ”رٹی ہوئی تقریر ہے۔“ امرت رائے اپنی سنتے میں موتھے۔ اس کا جواب نہ دیا۔

دان ناتھ نے پھر کہا ”صاف رٹی ہوئی تقریر ہے۔ یہاں بیٹھنا فضول ہے، ٹینس کا وقت لکلا جا رہا ہے۔“ امرت رائے نے پھر بھی کچھ جواب نہ دیا۔ آخر دان ناتھ نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ ”بھئی میں تو جاتا ہوں۔“ امرت رائے نے ان کی طرف بغیر دیکھے ہی کہا ”جائے شوق سے۔“

”تم کب تک بیٹھے رہو گے؟“

”میں تو آخر تک تقریر سن کر آؤں گا۔“

”بالکل بغلول ہو۔ یا آخر اس تقریر میں ہے کیا؟“



”تو تم جاؤ۔ میں تمھیں جبراً روکتا تو نہیں۔“

”اچی گھنٹوں بولے گا۔ رانڈ کا چرخہ ہے یا تقریر ہے۔“

”سنے بھی دو، بیکار بک بک کر رہے ہو۔ تمھیں جانا ہو تو جاؤ۔ میں تقریر ختم کر کے ہی اٹھوں گا۔“

”پچھتاوے گے۔ آج پر بیما بھی کھیلنے آئے گی۔“

”تم اس سے میری طرف سے معافی مانگ لینا۔“

”مجھے کیا غرض ہے کہ آپ کی طرف سے معافی مانگوں۔“

دان ناتھ آسانی سے گلا چھوڑنے والے آدمی نہ تھے۔ گھری نکال کر دیکھی، پہلو بدلا اور بے صبری کے انداز سے پھر امرت رائے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی توجہ تقریر کی طرف نہیں، مقرر کی ڈاڑھی کی طرف تھی۔ ڈاڑھی کی جبش پہم میں انھیں بڑا مزا آ رہا تھا۔ کچھ نہ کچھ بولتے رہنے کا مرض تھا۔ ایسا دلچسپ نظارہ دیکھ کر خاموش کیسے رہتے؟ امرت رائے کا ہاتھ دبا کر بولے ”آپ کی ڈاڑھی کتنی صفائی سے مل رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ نوچ کر رکھ دو۔“

امرт رائے نے مکدہ رہو کر کہا ”تم بڑے بد نصیب ہو کہ ایسی دل آؤیز اور پُر اثر تقریر کا لطف نہیں اٹھا سکتے۔“

مقرر نے کہا۔ ”میں آپ صاحبوں کے دو بر و تقریر کرنے نہیں کھڑا ہوا ہوں۔“

دان ناتھ۔ (آہستہ سے) ”اور کیا آپ گھاس کھونے آئے ہیں۔“

مقرر۔ ”باتیں بہت ہو چکیں اب عمل کا موقع ہے۔“

دان ناتھ۔ (آہستہ سے) ”جب آپ کی زبان آپ کے قابو میں رہے۔“

مقرر۔ ”جو اصحاب اپنی رفیق زندگی کا داغ اٹھا پکے ہیں وہ براہ کرم اپنے ہاتھ اٹھائیں۔“

دان ناتھ۔ (دلی آواز سے) ”اوفہ! یہاں تو آدھے سے زیادہ رنڈوں نکل آئے۔“

مقرر۔ ”جو اصحاب اس خیال سے متفق ہوں کہ رنڈوں کو کنواریوں سے شادی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے وہ براہ کرم اپنے ہاتھ اٹھائیں۔“

صرف ایک ہاتھ اٹھتا ہے! یہ بایو امرت رائے کا ہاتھ ہے۔ اہل جلسہ ان کی طرف پُرسوال دیچتی کی نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔

دان ناتھ نے امرت رائے کے کان میں کہا ”یہ کیا بیہودہ حرکت ہے؟ ہاتھ نیچے کرو۔“

امرт رائے۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں اس سے بہتر دوسرا معاشرتی اصول نہیں ہے۔“

مقرر نے امرت رائے کو ان کی اخلاقی جرأت پر مبارک باد دی۔ چند جملوں میں ناظرین کی پست ہمتی پر افسوس کیا اور بیٹھ گئے۔ جلد ختم ہو گیا۔

اہل جلسہ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، دان ناتھ بھی باہر چلے آئے مگر امرت رائے ابھی تک محیت کی حالت میں دنیا و مافیہا سے بے خبرا پی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دان ناتھ نے ایک منٹ تک باہر کھڑے ہو کر انتظار کیا، تب اندر جا کر بولے ”ارے اب تو چلو گے یا یہیں ڈھنی دو گے؟“

امرت رائے نے پوچنک کر کہا ”ہاں ہاں چلو۔“

دونوں دوست آ کر موڑ میں بیٹھے، موڑ چل پڑی۔

دان ناتھ کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ پوچھا ”آج تمھیں یہ حماقت کیا سوچھی؟“ امرت رائے نے تمسخر کے انداز سے جواب دیا ”وہی سوچھی جو تمھیں سوچھی۔“

”پر یہاں نے گی تو کیا کہے گی؟“

”بے حد خوش ہو گی۔“ کم سے کم اسے خوش ہونا چاہیے۔ اپنے احباب کو فرض کے سامنے سر جھکاتے دیکھ کر کون خوش نہیں ہوتا؟“

دان ناتھ نے ملامت کی ”ابی جاؤ بھی، باتیں بناتے ہو۔ اسے تم سے کتنی محبت ہے یہ تم سے پوچھنے نہیں ہے، ابھی شادی نہیں ہوئی (حالانکہ تم خود اس کے ذمہ دار ہو) یہ درست ہے۔ لیکن سارا شہر جانتا ہے کہ وہ تمھاری ملگیت ہے سوچواں کے اور تمھارے درمیان کتنی خط کتابت ہو چکی ہے۔ وہ دل میں تمھیں اپنا شوہر تسلیم کرچکی ہے، ایسی نازنین تمھیں دنیا کے پردے پر نہیں ملے گی۔ یہ سمجھ لو کہ تمھاری زندگی بتاہ ہو جائے گی۔ اپنے ساتھ اس کی زندگی بھی خراب کر دو گے۔ فرض کے نام پر جو چاہو کرو مگر پریا کو دل سے نہیں نکال سکتے۔“

امرت رائے متانت سے بولے ”یہ سب میں خوب سمجھ رہا ہوں بھائی جان، لیکن میرا خمیر کہہ رہا ہے کہ مجھے اس سے شادی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، پہلا امر ناتھ کی تقریر نے میری آنکھیں کھوں دیں۔“

امر ناتھ کا نام آتے ہی دان ناتھ نے ناک سکوڑ کر کہا۔

”کیا کہنا ہے واہ! اس نے رٹ کر ایک تقریر کر دی اور تم لٹو ہو گئے۔ یہ اچھا اصول ہے کہ جس کی پہلی بیوی مر چکی ہو وہ کسی کنوواری لڑکی سے شادی نہ کرے۔“

امر رائے نے کہا ”انصار تو بھی کہتا ہے۔“

دان ناتھ بولے ”تو بس ایک تمہارے انصاف پر چلنے سے قوم کی نجات ہو جائے گی، تم تھا کچھ نہیں کر سکتے، ہاں نکون سکتے ہو۔“

امر رائے نے پر زور نظر وہ سے تاکتے ہوئے کہا ”آدمی تھا بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔ تھا آدمیوں نے خیالات میں انقلاب پیدا کر دیے ہیں۔ دنیا کی صورت بدل دی ہے۔ افراد کی داستانِ عمل سے تاریخیں پُر ہیں۔ گوتم بدھ کون تھا؟ وہ تھا حق کی تلاش میں نکلا تھا اور اس کے دوران حیات میں ہی آدھی دنیا اس کے قدموں پر سر جھکا چکی تھی، افراد کے نام سے قوموں کے نام روشن ہیں، قومیں تباہ ہو گئیں آج ان کا نشان بھی باقی نہیں، مگر مخصوص ہستیوں کے نام بھی باقی ہیں۔ میں اکیلا کچھ نہ کرسکوں، یہ دوسری بات ہے۔ اکثر جماعتیں بھی کچھ نہیں کر سکتیں۔ میرا خیال ہے کہ جماعتیں کبھی کچھ نہیں کر سکتیں، لیکن آدمی اکیلا کچھ نہیں کر سکتا، میں اس لئے کوئی تسلیم نہ کروں گا۔“

دان ناتھ سہل پسند آدمی تھے۔ کسی اصول کے لیے تکلیف اٹھانا انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ ایک کالج میں پروفیسر تھے۔ گیارہ بجے جاتے تھے۔ دو بجے لوٹ آتے تھے۔ باقی سارا وقت کتب بینی اور سیر و تفریح میں اڑا دیتے تھے۔

اس کے برعکس امر رائے اصول پرور آدمی تھے اور بڑے ہم کے پکے۔ ایک بار کوئی فیصلہ کر کے اس سے محرف نہ ہوتے تھے۔ پیشہ و کالت تھا مگر اس پیشے سے انہیں نفرت تھی۔ بنائے ہوئے مقدمے بھول کر بھی نہ لیتے تھے، لیکن جو مقدمہ لے لیتے اس کے لیے جان لڑا دیتے تھے۔ بھی سب تھا، انہیں ناکامی کا صدمہ بہت کم اٹھانا پڑتا تھا۔ ان کی پہلی شادی اس وقت ہوئی تھی جب وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ ایک لڑکا بھی پیدا ہوا لیکن زچہ اور بچہ دونوں زچہ خانہ ہی میں داغ مفارقت دے گئے۔ امر رائے کو اپنی بہن سے بڑی محبت تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب کبھی شادی نہ کروں گا لیکن جب بہن کی شادی ہو گئی اور والدین بھی ایک ہفتہ کے اندر ہیئے کے شکار ہو گئے تو سونا گھر پھاڑ کھانے لگا۔ دو سال سیر و سیاحت میں برکیے، لوٹے تو ہوئی کے دن ان کے سر نے اس تقریب میں ان کی دعوت کی، وہ امر رائے کے اطوار پر پہلے ہی سے فدا تھے۔ ان کی چھوٹی لڑکی پر بیما اب شادی کے قابل ہو گئی تھی۔ اس کے لیے امر رائے سے بہتر شوہر انھیں دوسرا نظر نہ آیا۔ دو سال قبل امر رائے نے پریما کو دیکھا تھا۔ وہ شگفتہ لکی اب ایک شگفتہ پھول تھی جس کی نزاکت اور لطافت آنکھوں کو لمحاتی تھی۔ امر رائے کا غم نصیب دل یہاں سے محبت کا اثر لے کر لوٹا۔ تب سے جب طبیعت گھبرا تی سر اوال چلے جاتے اور دو گھنٹی ہنس بول کر چلے آتے۔ ایک دن ان کی ساسانے ان سے مطلب کی بات کہہ دی، امر رائے تو پریما کے رنگ و بو پر پہلے ہی ثار تھے۔ انہے کو جیسے آنکھیں مل گئیں۔ شادی طے ہو گئی اسی

مینے شادی ہونے والی تھی کہ آج امرت رائے نے عام جلسے میں اس نے اصول کو تسلیم کر کے اپنا ارادہ فقط کر دیا۔  
دان ناتھ نے ان کی لمبی تقریب سن کر کہا ”تو تمہارا یہ قطعی فیصلہ ہے۔“

”بیشک۔“

”اور پریما کو جواب دو گے؟“

”اسے مجھ سے بہت اچھا شور مل جائے گا۔“

دان ناتھ نے دلوسزی کے ساتھ کہا ”کیا باتیں کرتے ہو۔ تم سمجھتے ہو، محبت کوئی بازار کا سودا ہے۔ جی چاہالیا، جی چاہانہ لیا۔ مگر تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ پریما محض تمہاری مغیثت نہیں ہے، تمہاری مشوقہ بھی ہے۔ یہ خبر پا کر اس کے دل کی کیا کینیت ہوگی۔ شاید اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ تم اپنے ساتھ ہی نہیں اس کے ساتھ بھی بڑی بے انصافی کر رہے ہو۔“  
امرت رائے ایک لمحہ کے لیے فکر میں ڈوب گئے۔ اپنے متعلق تو انھیں ذرا بھی اندیشہ نہ تھا، وہ اپنے تیسیں فرض پر شمار کر سکتے تھے۔ لیکن پریما کا کیا حال ہوگا، اس کا خیال انھیں نہ آیا تھا۔ ہاں اتنا وہ جانتے تھے کہ پریما بلند خیال عورت ہے اور ان کے ایثار کی اس کی نگاہوں میں ضرور وقعت ہوگی۔ اگر وہ اتنی ہی فرض شناس ہے جتنا میں سمجھتا ہوں تو میرے اس فیصلے پر اسے مطلق رنج نہ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اسے خوشی ہوگی، کم از کم مجھے یہ امید ضرور ہے۔“

دان ناتھ نے منہ بنا کر کہا ”تم سمجھتے ہو گے کہ بڑا میدان مار آئے ہوا درجنے سے گاہوں پھولوں کا ہار لے کر تمہارے گلے میں ڈالنے دوڑے گا۔ لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم محض شہرت کے بھوکے ہو۔ لیکن عورتوں کو شہرت کی اتنی ہوں نہیں ہوتی۔ پریما کتنی ہی پاکیزہ خیال ہو وہ یہ کبھی پسند نہ کرے گی کہ تم اس سے اتنی بے دردی کے ساتھ کنارہ کش ہو جاؤ۔“

امرت رائے کا بغلہ آگیا۔ موڑ رک گیا۔ امرت رائے اتر کر اپنے کمرہ کی طرف چلے۔ دان ناتھ ذرا اس انتظار میں کھڑے رہے کہ یہ مجھے بلا میں تو میں جاؤں، لیکن جب امرت رائے نے ان کی طرف پھر کر بھی نہ دیکھا تو انھیں خوف ہوا کہ شاید میری باتیں انھیں ناگوار گزریں۔ کمرے کے دروازے پر جا کر بولے ”کیوں بھائی مجھ سے ناراض ہو گئے؟“

امرт رائے نے پر نم آنکھوں سے دیکھ کر کہا ”نہیں دان ناتھ تمہاری جھٹکیوں میں مزا ہے جو دوسروں کی واہ واہ میں نہیں۔ میں جانتا ہوں تم نے اس وقت جو کہا ہے وہ محض محبت سے کہا ہے، دل میں تو تم خوب سمجھتے ہو کہ میں شہرت کا حریص نہیں بلکہ زندگی میں کچھ کام کرنا چاہتا ہوں۔“

دان ناتھ نے اندر جا کر امرت رائے کا باتھ کپڑا لیا اور بولے ”پھر سوچ لو۔ ایسا نہ ہو پیچھے پیچھتا ناپڑے۔“

امرت رائے نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ بھائی جان بیچ پوچھو تو آج میں اپنے دل میں جس عالی ہمتی کا احساس کر رہا ہوں، وہ ایک نیا تجربہ ہے۔ آج کئی ماہ کی کشمکش کے بعد میں نے اپنے اوپر فتح پائی ہے۔ مجھے پریما سے جتنی محبت ہے، اس سے کئی گنی محبت میرے ایک دوست کو اس سے ہے۔ اس شریف آدمی نے کبھی بھول کر بھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا لیکن میں جانتا ہوں اس کی محبت کتنی جاں سوز، کتنی گھری اور کتنی پاکیزہ ہے۔ میں تقدیر کی کتنی چوٹیں سہمہ چکا ہوں۔ ایک چوٹ اور بھی سہمہ سکتا ہوں۔ لیکن میرے اس دوست نے ابھی ناکامی کی ایک چوٹ بھی نہیں سہی ہے اور یہ ناکامی اس کے لیے سوبان روح ہو جائے گی۔“

یہ اشارہ کس کی طرف تھا، دان ناتھ سے غصی نہ رہا۔ جب امرت رائے کی بیوی کا انتقال ہوا اسی وقت پریما سے دان ناتھ کی شادی کا تذکرہ درپیش تھا۔ جب پریما کی بہن کا انتقال ہو گیا تو اس کے والدالہ بدتری پر شادنے دان ناتھ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ دان ناتھ علم، دولت اور وقار، کسی بات میں بھی امرت رائے کے مقابل نہ تھے۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ پریما بھی امرت رائے کی جانب زیادہ متوجہ معلوم ہوتی تھی۔ دان ناتھ اتنے مایوس ہوئے کہ طے کر لیا بھی شادی نہ کروں گا۔ دونوں دوستوں میں ذرا بھی کدورت نہ پیدا ہوئی۔ دان ناتھ یوں بظاہر تو ہمیشہ خوش رہتے تھے لیکن دنیا سے ان کا دل بیزار ہو گیا تھا۔ زندگی با معلوم ہوتی تھی۔ امرت رائے کو اپنے دلی دوست کی حالت پر افسوس ہوتا تھا اور وہ اپنے دل کو اس آزمائش کے لیے میبوں سے تیار کر رہے تھے لیکن پریما جیسی عدیم المثال نازمین سے دست بردار ہو جانا آسان نہ تھا۔ ایسی حالت میں دان ناتھ کا یہ اصرار دوستانہ ہمدردی پر اتنا زیادہ بمنی نہ تھا جتنا امرت رائے کے جذبہ ایثار کی گہرائی تک پہنچنے کی خواہش پر، جس تمنا کو انھوں نے سینہ کو چیر کر نکال ڈالا تھا۔ جس کے پورے ہونے کی اس کی زندگی میں مطلق امید نہ تھی، وہی تمنا آج ان کے سینے میں مشعل کی طرح روشن ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی امرت رائے کے اس ملکوتی ایثار نے ان کے دل پر بہت گہرا اثر پیدا کیا۔ رفت آمیز لمحے میں بولے ”تو کیا اسی خیال سے تم نے آج یہ فیصلہ کر لیا۔ اگر تمہارا وہ دوست اس فیصلے سے فائدہ اٹھائے تو میں کہوں گا کہ وہ تمہارا دوست نہیں دشمن ہے۔ اور پھر کیا معلوم ہے کہ اس حالت میں پریما کی شادی تمہارے دوست سے ہی ہو۔“

امرт رائے نے تشویش ناک لمحے میں کہا ”ہاں یہ اندیشہ ضرور ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میرا دوست اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے گا۔“

دان ناتھ نے افردہ خاطر ہو کر کہا ”تم اسے اتنا کمینہ سمجھنا چاہو تو سمجھ لو لیکن میں کہہ دیتا ہوں کہ میں اس دوست کو پہچان سکا ہوں تو وہ اپنے عوض تھیس ناکامی کا شکار نہ بننے دے گا۔“

یہ کہتے ہوئے دان ناتھ باہر نکل آئے اور امرت رائے دروازے پر کھڑے انھیں پر غور نگاہوں سے دیکھتے رہے وہ دل میں کہہ رہے تھے، اس شخص میں کتنا ضبط ہے۔“

(2)

ادھر دونوں دوستوں میں باتیں ہو رہی تھیں ادھر لالہ بدربی پرشاد کے گھر میں مقام ساچھالیا ہوا تھا۔ بڑی دیر کے بعد ان کی بیوی دیوکی نے کہا ”تم ذرا امرت رائے کے پاس چلے کیوں نہیں جاتے؟“

بدربی پرشاد نے اعتراض کے انداز سے کہا ”جا کر کیا کروں۔“  
”جا کر سمجھاؤ اور کیا کرو گے۔“

”میں اس چھوکرے کے پاس نہیں جا سکتا۔“

”آخر کیوں؟ کوئی ہرج ہے۔“

”اب تم سے کیا بتاؤں۔ جب مجھے اس کا فیصلہ معلوم ہو گیا تو میرا اس کے پاس جانا غیر مناسب ہی نہیں، اہانت آمیز ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ بد صوابوں (پدھاریاں) کے حامی ہیں۔ سمجھتے ہیں اس سے ملک آسمان پر پہنچ جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں بدھوا بوہا ملک کے لیے زہر قاتل ہے اس سے ہندو عظمت اور پاکیزگی کے رہے سہنے شان بھی مٹ جائیں گے۔ ایسی حالت میں ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔“

دیوکی نے جواب دیا ”یہ کوئی بات نہیں ہے۔ آج اگر ہمارا کمال مسلمان ہو جائے تو کیا ہم اس کے پاس آنا جانا چھوڑ دیں گے؟ ہم سے جہاں تک ہو سکے گا اسے سمجھائیں گے اور اسے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کریں گے۔“

دیوکی کے اس جواب سے بدربی پرشاد پکھ نرم تو پڑے لیکن پھر بھی قائل نہ ہوئے۔ بولے ”بھتی میں توبہ امرت رائے کے پاس نہ جاؤں گا۔ تم اگر سوچتی ہو کہ وہ سمجھانے سے راہ راست پر آ جائیں گے تو انھیں بلا لو، خود چل جاؤ لیکن مجھ سے جانے کونہ کہو، میں انھیں دیکھ کر شاید آپے سے باہر ہو جاؤں۔ کہو تو جاؤں؟“

دیوکی۔ ”نہیں معاف کیجیے۔ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ تم نہ جاؤ۔ میں کل انھیں بلا لوں گی۔“

بدربی۔ ”بلانے کو بلا لو، لیکن یہ میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ تم ان کی خوشامد کرو۔“ میں پریما کوان کے گلے لگانہیں چاہتا۔ اس کے لیے بر کی کمی نہیں ہے۔“

دیوکی۔ ”پریما ان لڑکیوں میں نہیں ہے کہ تم اس کی شادی جس کے ساتھ چاہو کر دو، ذرا جا کر اس کی حالت تو دیکھو تو معلوم

ہو، جب سے یہ خبر ملی ہے اکیلی چھت پر پڑی رورہی ہے۔“

بدری۔ ”اچی یہ تو لڑکیوں کا قاعدہ ہے، دس پانچ روز میں آپ ہی آپ سنجل جائے گی۔“

دیوکی۔ ”کون پریما؟ میں کہتی ہوں وہ اس غم میں روکر جان دے دے گی۔ تم ابھی اسے نہیں جانتے۔“ بدری پرشاد نے چھنچلا کر کہا ”اگر وہ رورو کمر جانا چاہتی ہے تو مر جائے لیکن میں امرت رائے کی خوشامد نہ کروں گا۔“

بدری پرشاد باہر چلے گئے، دیوکی بڑے شش و پیچ میں پڑ گئی۔ شوہر کی عادت سے خوب واقف تھی۔ لیکن انھیں اتنا کچھ فہم اس نے نہ سمجھا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ امرت رائے سمجھانے پر اپنا فیصلہ تبدیل کر دیں گے لیکن ان کے پاس کیسے جائے، شوہر سے راڑ کیسے مول لے۔

دفعتاً پریما اور سے آکر چارپائی کے پاس کھڑی ہو گئی، اس کی آنکھیں سرخ تھیں، دیوکی نے سمجھا کر کہا ”رمٹت بیٹی۔ میں کل انھیں بلا لوں گی، میری بات وہ بھی نہ ٹالیں گے۔“

پریما نے سکیاں لیتے ہوئے کہا ”نہیں اماں آپ کے بیرون پڑتی ہوں، ان سے کچھ نہ کہیے۔ میں کار خیر میں رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہتی۔ انھوں نے ہماری بد نصیب بہنوں کی خاطر یہ فیصلہ کیا ہے۔ ہمارے یہاں کتنے ایسے آدمی ہیں جو اتنی جرات کر سکتے۔ میں ان کے اس نیک ارادہ میں حائل نہ ہوں گی۔“

دیوکی نے حیرت زدہ نگاہ ہوں سے پریما کو دیکھا۔ لڑکی کیا کہہ رہی ہے، ان کی سمجھ میں نہ آیا۔

پریما پھر بولی ”اگر ایسے نیک طبیعت اور روش خیال آدمی قربانیاں نہ کریں گے تو کون کرے گا؟“

دیوکی نے پوچھا ”اور تو، اپنے دل کو کیسے سمجھائے گی بیٹی۔ اس خیال سے تجھے تسلیم ہو گی۔“

پریما نے ممتاز سے جواب دیا ”مجھے اس کا بالکل دکھ نہیں ہے، اماں جی! میں آپ سے سچ کہتی ہوں، میں بھی اس کام میں ان کی مدد کروں گی۔ جب تک آپ لوگوں کا ہاتھ میرے سر پر ہے مجھے کس بات کی فگر ہے۔ آپ لوگ میرے لیے ذرا بھی اندیشہ نہ کریں۔ میں کنواری رہ کر بہت سکھی رہوں گی۔“

دیوکی نے پرائیک نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ”ماں باپ کس کے سدا بیٹھے رہتے ہیں بیٹی! اپنی آنکھوں کے سامنے ذرا جو کام ہو جاوے وہی اچھا۔ لڑکی تو ان کی بھی کنواری نہیں رہنے پاتی جن کے گھروں میں کھانے کا ٹھکانا نہیں ہے۔ بھیک مانگ کر لوگ لڑکی کا بیاہ کرتے ہیں۔ محلہ میں کوئی لڑکی یتیم ہو جاتی ہے تو چندہ سے اس کا بیاہ کر دیا جاتا ہے، میرے یہاں کس بات کی کمی ہے؟ میں تمہارے لیے کوئی اور لڑکا تلاش کروں گی۔ یہ جانے سے آدمی تھے۔ اتنا ہی تھا ورنہ برادری میں ایک سے ایک پڑے ہوئے ہیں۔ میں کل تمہارے بابو جی کو ٹھیک ہوں۔“

پریما کا دل کا پ اٹھا۔ آج تین برس سے امرت رائے کی مورت کو اپنے دل کے مندر میں بٹھا کر وہ پوجتی چلی آئی تھی، اس مورت کو اس کے دل سے کون نکال سکتا تھا۔ دل میں اس مورت کو بٹھائے ہوئے کیا وہ کسی دوسرا شخص سے بیاہ کر سکتی تھی؟ وہ بیاہ ہو گا یا بیاہ کا ڈھونگ؟ اس زندگی کا خیال کتنا خوفناک، کتنا دل ہلا دینے والا تھا؟ پریما نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔

”نہیں اماں جی! میرے لیے کوئی فکر نہ کریں۔ میں نے کنواری ہی رہنے کا قصد کر لیا ہے۔“

”بابو ملا پرشاد کی آمد آمد کا شور سنائی دیا، آپ سینما کے بے طرح ولدا د تھے۔ روز ہی جایا کرتے تھے۔ نوکروں سے وہ سختی کے ساتھ کام لیتے تھے۔ خصوصاً باہر سے آنے پر تو کسی ایک کی مرمت سے باز نہ رہ سکتے تھے۔ ان کے بوٹ کی چرچا ہٹ سنتے ہی نوکروں میں بلچل پڑ جاتی تھی۔“

کملہ پرشاد نے آتے ہی کہار سے پوچھا ”برف لائے؟“

کہار نے دبی زبان سے کہا ”ابھی تو نہیں سرکار۔“

کملہ پرشاد نے گرج کر کہا ”زور سے بولا، برف لائے یا نہیں؟ منہ میں زبان نہیں ہے۔“

کہار کی آواز اب بالکل بند ہو گئی۔ کملہ پرشاد نے کہار کے دونوں کانوں کو کپڑا کر ملاتے ہوئے کہا ”ہم پوچھتے ہیں برف لائے یا نہیں؟“

کہار نے دیکھا کہ اب بغیر منہ کھولے ہوئے کانوں کے اکھڑ جانے کا احتمال ہے تو آہستہ سے بولا۔ نہیں سرکار!

کملہ۔ کیوں نہیں لائے؟

کہار۔ پیسے نہ تھے۔

کملہ۔ کیوں پیسے نہ تھے؟ گھر میں جا کر مانگے تھے؟

کہار۔ ”ہاں سرکار کسی نے سنانیں۔“

کملہ۔ ”جبوٹ بولتا ہے۔ میں جا کر دریافت کرتا ہوں، اگر معلوم ہوا کہ تو نے پیسے نہیں مانگے تو کچا ہی کھا جاؤں گا راسکل۔“

کملہ پرشاد نے کپڑے بھی نہیں اتارے۔ غصہ میں بھرے ہوئے گھر میں جا کر ماں سے پوچھا ”کیوں اماں! بد لو تم سے برف کے لیے پیسے مانگنے آیا تھا۔“

دیوکی نے بغیر ان کی طرف دیکھے ہی کہا ”آیا ہو گا، یاد نہیں آتا، بابو امرت رائے سے ملاقات تو نہیں ہوئی؟“

کملہ۔ ”نہیں ان سے تو ملاقات نہیں ہوئی۔ ان کی طرف گیا تھا لیکن جب سنا کہ وہ کسی جلسہ میں گئے ہیں تو میں سینما

دیکھنے چلا گیا۔ جلوں کا تو انھیں مرض ہے اور میں بالکل فضول سمجھتا ہوں، کوئی فائدہ نہیں۔ بغیر لکھر سے بھی آدمی زندہ رہ سکتا ہے اور لکھر دینے والوں کے بغیر دنیا کے پاتال میں چلے جانے کا اندیشہ نہیں۔ جہاں دیکھو لکھر اسی لکھر ار نظر آتے ہیں۔ بر ساتی مینڈ کوں کی طرح ٹرٹر کیا اور چلتے ہوئے۔ اپنا وقت کھویا اور دوسروں کو پریشان کیا۔ سب کے سب بیوقوف ہیں۔“

دیوکی۔ ”امرت رائے نے تو آج ناؤ ہی ڈیودی، اب کسی بدھوا سے بیاہ کرنے کی ٹھان لی ہے“ کملا پرشاد نے زور سے قہقہہ لگا کر کہا۔ اور یہ جلسے والے کریں گے کیا؟ یہی تو ان سمجھوں کو سمجھتی ہے۔ لالہ اب کسی بیوہ سے شادی کریں گے؟ اچھی بات ہے میں ضرور بارات میں جاؤں گا۔ خواہ اور کوئی جائے یا نہ جائے۔ ذرا دیکھوں نئے ڈھنگ کی شادی کیسی ہوتی ہے۔ وہاں بھی سب لکھر بازی کریں گے۔ ان لوگوں کے لیے اور کیا ہوگا۔ سب کے سب بیوقوف ہیں۔ عقل کسی کو چھو نہیں گئی۔“

دیوکی۔ ”تم ذرا ان کے پاس چلے جاتے۔“

کملا۔ ”اس وقت تو بادشاہ بھی بلاۓ تو نہ جاؤں۔ ہاں کسی روز جا کر ذرا خیر و عافیت پوچھ آؤں گا۔ مگر ہے پورا خبیثی! میں تو جانتا تھا کہ اس میں کچھ سمجھ ہو گی مگر زارونگا لکلا! اب بتاؤ زیادہ پڑھنے سے کیا فائدہ ہوا؟ بہت اچھا ہوا کہ میں نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ بہت پڑھنے سے عقل ماری جاتی ہے۔ جب آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں تو عقل کیسے بچی رہ سکتی ہے؟ تو کوئی بیوہ بھی ٹھیک ہو گئی یا نہیں؟ کہاں ہے مصراںی؟ کہہ دو کہ اب تمہاری چاندی ہے۔ کل ہی سنن لیں بیچج دیں۔ کوئی اور نہ جائے تو میں جانے کو تیار ہوں۔ بڑا مزار ہے گا! کہیں ہے مصراںی۔ اب ان کی قسمت کھل رہے گی۔ برادری ہی کی بیوہ ہے نا، کہ برادری کی قید بھی نہیں رہی؟۔

دیوکی۔ یہ تو نہیں جانتی اب کیا ایسے بھر شٹ (نایاک) ہو جائیں گے۔

کملا۔ ”یہ سجاوائے۔ جو کچھ نہ کر گزریں وہ تھوڑا۔ ان سمجھوں کو میٹھے بیٹھے ایسی بے پر کی اڑانے کی سمجھتی ہے۔ ایک روز پنجاب سے کوئی بکھل (خبیثی) آیا تھا کہہ گیا کہ ذات پات توڑ دو، کیوں کہ اس سے ملک میں بچوٹ بڑھتی ہے۔ بس سب کے سب بیٹھے یہی سوچا کرتے ہیں کہ کوئی نئی بات نکالنی چاہیے۔ گاندھی جی کو اور کچھ نہ سوچھی تو سوراج ہی کاڑنا کا پیٹھ چلے۔ سمجھوں نے عقل بیچ کھائی ہے۔“ اتنے ہی میں ایک حسینہ نے صحن میں قدم رکھا۔ کملا پرشاد کو دیکھ کر ڈیوڑھی پڑھٹک گئی۔ دیوکی نے کملا سے کہا۔

”تم ذرا کمرہ میں چلے جاؤ۔ پورا ڈیوڑھی پکھڑی ہے۔“

پورنا کو دیکھتے ہی پریما دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ پڑوں میں ایک پنڈت بستت کمار رہت تھے۔ کسی دفتر میں نوکر تھے، پورنا انھیں کی بیوی تھی، بہت ہی حسین، بہت ہی نیک، مکان میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ جب دس بجے پنڈت جی دفتر چلے جاتے تو وہ بیہیں چلی آتی اور دو سہیلیاں شام تک بیٹھی ہنستی بولتی رہتیں۔ پریما کو اس سے اتنی محبت تھی کہ اگر کسی دن وہ کسی سبب سے نہ آتی،

وہ خود اس کے یہاں جاتی۔ آج بست کمار کہیں دعوت میں گئے تھے، پورنا کا جی گھبرا یا تو وہ یہاں چلی آئی۔ پریما اس کا ہاتھ پکڑے اور پر کمرے میں لے گئی۔

پورنا نے چادر اگنی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے بھیا آنگن میں کھڑے تھے اور میں منہ کھولے چلی آئی تھی۔ مجھ پر ان کی نظر پڑ گئی ہو گی۔“

پریما۔ ”بھیا میں کسی کوتا کرنے کی لٹ نہیں ہے۔ یہی تو ان میں ایک گن (وصف) ہے۔ آپ کے پنڈت جی کہیں گئے ہیں کیا؟“

پورنا۔ ”ہاں آج ایک نیو تے (دعوت) میں گئے ہیں۔“

پریما۔ ”سبھا میں نہ گئے۔ آج تو بہت بھاری سبھا ہوئی ہے؟“

پورنا۔ ”وہ کسی سبھا سماج میں نہیں جاتے۔ کہتے ہیں کہ ایشور نے دنیا بنائی ہے اور وہی اپنی مرضی سے ہربات کا بندوبست کرتا ہے۔ میں اس کے کاموں کو سدھارنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔“

پریما۔ ”آج کی سجادی کیخنے کے لائق تھی۔ تم ہوتیں تو میں بھی جاتی۔ سماج سدھار پر ایک مہاشے کا بڑا اچھا لکپڑا ہوا۔“

پورنا۔ ”عورتوں کے سدھار کا رونارویا گیا تھا۔“

پریما۔ ”تو کیا عورتوں کے سدھار کی ضرورت نہیں ہے۔“

پورنا۔ ”پہلے مرد لوگ تو اپنی دشا (حالت) سدھار لیں۔ پھر عورتوں کی دشا سدھار لیں گے۔ ان کی دشا سدھر جائے تو

عورتیں آپ ہی آپ سدھر جائیں۔“

”ساری براجیوں کی جڑ مرد ہی ہیں۔“

پریما نے ہنس کر کہا۔ ”نہیں بہن! سماج میں عورت مرد دنوں ہی ہیں اور جب تک دنوں کا سدھارنہ ہو گا زندگی میں سکھنہ ملے گا۔ مردوں کے دو دن ہونے سے کیا عورتیں دو دن ہو جائیں گی۔ مرد تو زیادہ تر سادے ہی کپڑے پہنتے ہیں۔ پھر عورتیں کیوں گھنوں پر جان دیتی ہیں۔ قیقتی کپڑوں کی تو کوئی بات نہیں۔ مردوں میں تو کتنے ہی بن بیاہ رہ جاتے ہیں۔ عورتوں کو کیوں بن بیاہ رہنے میں زندگی بیکار معلوم ہوتی ہے؟ ہتھ میں تو سوچتی ہوں کہ بن بیاہ رہنے میں جو سکھ ہے وہ بیاہ کر رہنے میں نہیں۔“

پورنا نے آہستہ سے پریما کو دھکا دے کر کہا۔ ”چلو بہن تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو۔ با بوا مرت رائے سنیں گے تو تمہاری خوب خبر لیں گے۔ میں انھیں لکھ سمجھیوں گی کہ یہ اپنا بیاہ نہ کریں گی، آپ کوئی دوسرا دروازہ دیکھیں۔“

پریمانے امرت رائے کے عہد کا حال نہ کہا۔ وہ جانتی تھی کہ اس سے پورنا کی نگاہ میں ان کی قدر بہت کم ہو جائے گی۔ بولی

”وہ خود بیاہ نہ کریں گے۔“

پورنا۔ ”چلو جھوٹ بکتی ہو۔“

پریما۔ ”نہیں بہن جھوٹ نہیں۔ شادی کرنے کی ان کی خواہش نہیں ہے۔ دیدی (بڑی بہن) کے مرجانے کے بعد وہ کچھ تیاری سے ہو گئے تھے۔ باجوہی کے بہت گھیرنے پر اور مجھ پر رحم کر کے وہ شادی کرنے پر تیار ہوئے تھے، مگر اب ان کا ارادہ بدل گیا ہے۔ اور میں بھی سمجھتی ہوں کہ جب ایک شخص خود گرتی کے جھنجھٹ میں نہ پھنس کر سماج کی سیوا کرنا چاہتا ہے تو اس کے پیر کی بیڑی بنناٹھیک نہیں ہے۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں پورنا، مجھے اس کا رنخ نہیں ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں بھی کچھ کرے جاؤں گی۔“ پورنا کی حرمت بڑھتی ہی گئی بولی۔ ”آج چار بجے تک تم ایسی باتیں نہ کرتی تھیں۔ لیکا یہ کیسی کام بپڑ ہو گئی۔ انہوں نے کسی سے کچھ کہا ہے کیا۔“

پریما۔ ” بلا کہے بھی تو آدمی اپنی خواہش ظاہر کر سکتا ہے۔“

پورنا۔ ”میں ایک خط لکھ کر ان سے پوچھوں گی۔“

پریما۔ ”نہیں پورنا، تمہارے بیرون پڑتی ہوں، خط و ط نہ لکھنا، میں کسی کے نیک ارادے میں رکاوٹ نہ ڈالوں گی، میں اگر اور کوئی مدد نہیں کر سکتی تو کم سے کم ان کی راہ کا کانٹا نہ بنوں گی۔“

پورنا۔ ”ساری عمر روتے کٹے گی کہے دیتی ہوں۔“

پریما۔ ”ایسا کوئی دکھنیں ہے جو آدمی سہہ نہ سکے۔ وہ جانتے ہیں کہ مجھے اس سے دکھنیں سکھ ہو گا۔ ورنہ وہ بھی ایسا ارادہ نہ کرتے۔ میں ایسے حوصلے والے آدمی کا حوصلہ بڑھانا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ اسے گرتی میں نہیں پھنسانا چاہتی۔ پورنا نے بے پرواٹی سے کہا۔ ”تمہاری مایا (لیلا) میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بہن، معاف کرنا۔ میں بھی نہ مانوں گی کہ تم کو اس سے دکھنے ہو گا۔“

پریما۔ ”تو پھر انھیں بھی ہو گا؟“

پورنا۔ ”مردوں کا دل سخت ہوتا ہے۔“

پریما۔ ”تو میں بھی اپنا دل سخت بنا لوں گی۔“

پورنا۔ ”اچھا بنا لینا۔ لواب نہ کھوں گی۔ لا اُباجہ، تمھیں ایک گیت سناؤں پریما نے ہار موئیم سنپھالا اور پورنا گانے لگی۔“

(3)

ہولی کا دن آیا، محلے کے دوچار بے فکرے جمع ہو گئے۔ کوئی مرچ پیسے لگا۔ کوئی بادام چھینے لگا۔ دوآدمی دودھ کا بندوبست کرنے کے لیے گئے دوآدمی سل بیاد ہونے لگے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

دفعتاً با یوملا پرشاد آپنے۔ یہ جھگھڑا کیہ کر بولے۔ ”کیا ہورہا ہے بھئی! ہمارا بھی حصہ ہے نا؟“

بسنت کمار نے آگے بڑھ کر خیر مقدم کیا۔ بولے ”ضرور میٹھی پیجی گا کہ نمکین؟“

کملًا۔ ابی میٹھی پلاو نمکین کیا۔ مگر یار زعفران اور کیوڑا ضرور ہو۔ کسی کو سمجھیے۔ میرے یہاں سے لے آئے۔ کسی لڑکے کو سمجھیے

جو اندر جا کر پریما سے مانگ لائے، کہیں یوی صاحب کے پاس نہ چلا جائے ورنہ مفت گالیاں ملیں، تو یہاں کے دن ان کا مزاج گرم ہو جایا کرتا ہے۔ یارِ بسنت کمار یویوں کے خوش رکھنے کا آسان نسخہ بتاؤ میں تو عاجز آگیا۔“

بسنت کمار نے مسکرا کر کہا۔ ”ہمارے یہاں تو یہ مرض کبھی نہیں ہوتا۔“

کملًا۔ ”تو یار تم بڑے خوش نصیب ہو، کیا پورنام سے کبھی نہیں روکھتی؟“

بسنت۔ ”کبھی نہیں۔“

کملًا۔ ”کبھی کسی چیز کے لیے ضد نہیں کرتی۔“

بسنت۔ ”کبھی نہیں۔“ یہاں تو دوامی قید ہو گئی ہے اور گھڑی بھر بھی گھر سے باہر ہوں تو جواب طلب ہوتا ہے۔ سینما روزانہ

جاتا ہوں اور ہر روز گھنٹوں مناؤ کرنا پڑتا ہے۔“

بسنت۔ ”تو سینما دیکھنا چھوڑ دیجیے۔“

کملًا۔ ”واہ واہ۔ یہ تو تم نے خوب کہی، قسم اللہ پاک کی خوب کہی، جس کل وہ بٹھائے اسی کل بیٹھ جاؤ۔ پھر جھگڑا ہی نہ ہو۔ کیوں؟ اچھی بات ہے۔ کل دن بھر گھر سے نکلوں گا نہیں۔ دیکھوں تو تب کیا کہتی ہے۔ دیکھنا اب تک وہ چھوکرا زعفران اور

کیوڑا لے کر نہیں لوٹا۔ کان میں بھنک پڑ گئی ہو گی، پر یہاں کو منع کر دیا ہو گا۔ اب تو نہیں رہا جاتا۔ آج جو کوئی میرے منہ لگا تو برا ہو گا۔ میں ابھی جا کر سب چیزیں بھیجے دیتا ہوں۔ مگر جب تک میں نہ آؤں آپ تیار نہ کرائیے گا۔ یہاں اس فن کے استاد ہیں۔ موروثی

بات ہے۔ دادا ایک تولہ کا ناشتہ کرتے ہیں۔ عمر میں کبھی ایک دن کا بھی نامنہیں کیا، مگر کیا مجال کہ نشہ ہو جائے۔“

یہ کہہ کر کملا پرشاد جملائے ہوئے گھر چلے گئے۔ بسنت کمار کسی کام سے اندر گئے تو دیکھا کہ پورنا اپنی پیس رہی ہے۔ پنڈت جی کے بیاہ کے بعد یہ دوسری ہوئی تھی۔ پہلی ہوئی میں بے چارے خالی ہاتھ تھے۔ پورنا کی کچھ خاطر نہ کر سکے تھے۔ مگر اب کے انھوں نے بڑی تیاریاں کی تھیں۔ محنت کر کے کوئی ڈیری ہے سور ویس پیدا کیے تھے۔ اس میں پورنا کے لیے ایک عمدہ ساڑھی لائے تھے۔ دو ایک چھوٹی مولیٰ چیزیں بھی بنوادی تھیں۔ پورنا آج وہ ساڑھی پین کر انھیں اپرسا می معلوم پڑنے لگی۔ پاس جا کر بولے ”آج تو بھی چاہتا ہے تمیں آنکھوں میں بٹھا لوں۔“

پورنا نے اپنی ایک پیالی میں اٹھاتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر کہا ”یہ دیکھو میں تو پہلے ہی بیٹھی ہوئی ہوں۔“

بسنت۔ ”ذرا اشناز کرتا آؤ۔ کملا با بواب دس بجے سے پہلے نہ لوٹیں گے۔“

پورنا۔ ”پہلے ذرا بہاں آ کر بیٹھ جاؤ۔ اپنے تو لگا دوں۔ پھر نہایہ جانا۔“

بسنت۔ ”نبیں نہیں، رہنے دو۔ میں اپنے نہ لگا دوں گا۔ لا دی میری دھوتی دو۔“

پورنا۔ ”واہ اپنے کیوں نہ لگاؤ گے۔ آج کی یہ رسم ہے۔ آ کے بیٹھ جاؤ۔“

بسنت۔ ”بڑی گرمی ہے۔ بالکل جی نہیں چاہتا۔“

پورنا نے لپک کر انکا ہاتھ کپڑا لیا اور اپنی بھرہ اپنے ان کے بدن پر پھیر دیا۔ بولی ”سید ہے سے کہتی تھی تو نہیں مانتے تھے۔ اب تو بیٹھو گے۔“

بسنت نے جھینپ کر کہا۔ ”مگر ذرا جلدی کرنا دھوپ ہو رہی ہے۔“

پورنا۔ ”اب گرگا جی کہاں جاؤ گے یہیں نہایہ۔“

بسنت۔ ”نبیں۔ آج گرگا کنارے بڑی بہار ہو گی۔“

پورنا۔ ”اچھا تو جلدی لوٹ آنا۔ نہیں کہ ادھر ادھر تیر نے لگو۔ نہایت وقت تم بہت دور تک تیر جایا کرتے ہو۔“

پنڈت جی اپنے لگو کرنے کے لیے چلے گئے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ گھاٹ سے ذرا الگ نہایا کرتے تھے۔ تیراں بھی اچھے تھے۔ کئی بار شہر کے اچھے تیراں سے بازی جیت پکے تھے۔ اگرچہ آج گھر سے وعدہ کر کے چلے تھے کہ تیروں گا نہیں۔ مگر ہوا کے بلکہ جھونک اور صاف پانی میں اٹھتی ہوئی لہریں ایسی بھلی معلوم ہوتی تھیں کہ دل تیرنے کے لیے بے قرار ہوا ٹھا۔ وہ فوراً پانی میں کوڈ پڑے اور ادھر ادھر کلپیں کرنے لگے۔ دفتار انھیں مخدھار میں کوئی سرخ چیز بھتی نظر آئی۔ غور سے دیکھا تو کنول تھے۔ آفتاب کی شعاعوں میں چکتے ہوئے وہ ایسے خوشما معلوم ہوتے تھے کہ بسنت کمار کا جی ان پر لچا گیا۔ سوچا کہ اگر یہ میں تو پورنا کے

کانوں کے لیے جھوک بناو۔ اس کی خوشی کا اندازہ کر کے ان کا دل ناج اٹھا۔ پیچ دھارے تک تیر جانا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ انھیں پورا یقین تھا کہ میں پھول لاسکتا ہوں۔ جوانی دیوانی ہے۔ یہ نہ سوچ کہ جیوں جیوں میں آگے بڑھوں گا پھول بھی تو بڑھیں گے۔ ان کی طرف چلے اور کوئی پندرہ منٹ میں منجھدار میں پہنچ گئے۔

مگر وہاں جا کر دیکھا تو پھول اتنی ہی دور آگے تھے۔ اب کچھ تکان معلوم ہونے لگی تھی۔ مگر پیچ میں کوئی ریت بھی نہ پڑتی تھی جس پر بیٹھ کر دم لیتے۔ آگے ہی بڑھتے گئے کبھی ہاتھ کبھی پیروں سے زور لگاتے، پھولوں تک پہنچ۔ مگر اس وقت تک کل اعضا سست پڑ گئے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے جب پھولوں کو کپڑنے کے لیے ہاتھ بڑھانا چاہا تو ہاتھ نہ اٹھ سکا۔ آخر ان کو دانتوں میں دبایا اور پلٹ پڑے۔ مگر جب وہاں سے انھوں نے کنارے کی طرف دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ یہاں پر اس کی منزل ہے۔ بدن بالکل مژھ حال ہو گیا تھا اور پانی کا بہاؤ بھی خلاف تھا۔ ان کی بہت چھوٹ گئی۔ ہاتھ پر ڈھیلے پڑ گئے۔ قریب کوئی کشتمانی یا ڈوگی نہ تھی اور کنارے تک آواز ہی نہ پہنچ سکتی تھی۔ سمجھ گئے یہیں غرق دریا ہونا پڑے گا۔ ایک لمبے کے لیے پورنا کی یاد آئی۔ ہائے وہ ان کی راہ دیکھ رہی ہو گئی۔ اسے کیا معلوم وہ اپنی زندگی کا خاتمه کر چکے۔ بسنت کارنے ایک بار پھر زور لگایا مگر ہاتھ پر بہنہ ہل سکے۔ اب ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ کنارے پر سے لوگوں نے انھیں دیکھا۔ دو چار آدمی پانی میں کوڈ پڑے۔ مگر ایک ہی لمبے میں بسنت کمار لہروں میں سما گئے۔ صرف کنوں کے پھول پانی میں تیرتے رہ گئے گویا زندگی کا خاتمه ہو جانے کے بعد اس کی ناکام آرزوئیں اپنا خونیں جلوہ دکھار ہی تھیں۔

#### (4)

لالہ بدری پرشاد کی شرافت مشہور تھی۔ ان سے ٹھنگ کر کوئی پیسہ بھی نہ لے سکتا تھا۔ مذہب کے معاملہ میں وہ بہت ہی فراخ دل تھے۔ خود غرضیوں سے وہ کوسوں بھاگتے تھے، مگر محتاجوں کی مدد کرنے میں کبھی نہ چوکتے تھے۔ پھر پورنا تو ان کی پڑوں ہی نہیں برہمنی بھی تھی، اس پر ان کی لڑکی کی سہیلی، اس کی مدد وہ کیوں نہ کرتے؟ پورنا کے ساتھ دو چار معمولی گھنوں کے سوا اور کیا تھا۔ تیرھوں کے دن اس نے وہ سب گئے لا کر لالہ جی کے سامنے رکھ دیے اور آبدیدہ ہو کر بولی۔ ”میں اب انھیں رکھ کر کیا کروں گی۔“ بدری پرشاد نے رقت آمیز لہجہ میں کہا ”میں انھیں لے کر کیا کروں گا بیٹی! تم یہ سمجھو کر میں دھرم یا پُن سمجھ کر یہ کام کر رہا ہوں۔ یہ میرا فرض ہے۔ ان گھنوں کو اپنے پاس رکھو۔ کون جانے کس وقت ان کی ضرورت پڑے۔ جب تک میں زندہ ہوں تمھیں اپنی بیٹی سمجھتا ہوں گا۔ تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔“

تیرھویں بڑی دھوم سے ہوئی۔ کئی سورہمنوں نے کھانا کھایا۔ دن دچھنا میں بھی کوئی کمی نہ کی گئی۔

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ لا الہ بدری پرشاد برہمنوں کو کھانا کھلا کر لوٹے تو دیکھا کہ پریما ان کے کمرے میں کھڑی ہے۔

بولے ”یہاں کیوں کھڑی ہو بیٹی! رات بہت ہو گئی جا کر سورہ ہو۔“

پریما۔ آپ نے ابھی کھانا نہیں کھایا ہے نا؟

بدری۔ اب اتنی رات گئے میں کھانا نہ کھاؤں گا۔ تھک بھی بہت گیا ہوں لیتھے ہی سوجاؤں گا۔

یہ کہ کہ بدری پرشاد پلنگ پر بیٹھ گئے اور ایک لمحہ کے بعد بولے۔ ”کیوں بیٹی پورنا کے مائیک میں کوئی نہیں ہے؟ میں نے اس

سے نہ پوچھا کہ شاید اس کو رنج ہو۔“

پریما۔ مائیک میں کون ہے، ماں باپ پہلے ہی مر چکے تھے، ماں نے بیاہ کر دیا تھا۔ مگر جب سے بیاہ ہوا پھر بھی جھانکے تک نہیں۔ سرال میں بھی۔ سگا کوئی نہیں ہے۔ پنڈت جی کے دم سے ناتا تھا۔

بدری پرشاد نے بستر کی چادر برابر کرتے ہوئے کہا ”میں سوچتا ہوں کہ پورنا کو اپنے ہی مکان میں رکھوں تو کیا ہرج ہے؟

اکیلی عورت کیسے رہے گی؟“

پریما۔ ہو گا بہت اچھا۔ مگر اماں جی مانیں تب تو۔

بدری۔ مانیں گی کیوں نہیں، پورنا تو انکار نہ کرے گی؟

پریما۔ ”پوچھوں گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ انھیں انکار نہ ہو گا۔“

بدری۔ ”اچھا مان لو کہ وہ اپنے ہی گھر میں رہے تو اس کا خرچ کوئی میں روپیہ میں چل جائے گا۔“

پریما نے احسان مند رہوں سے والد کی طرف دیکھ کر کہا ”بڑے مزے سے۔ پنڈت جی بچا سہی روپیہ تو پاتے تھے۔“

بدری پرشاد نے تشویش کے لیجھ میں کہا ”میرے لیے میں، پچیس، تمیں سب برابر ہیں۔ مگر مجھے اپنی زندگی ہی کی بات تو

نہیں سوچتی ہے۔ اگر آج نہ رہوں تو کمال کل کوئی کوڑی پھوڑ کر نہ دے گا، اس کے لیے کوئی مستقل بندو بست کر دیا چاہتا ہوں۔ ابھی ہاتھ میں روپیہ نہیں ہے، ورنہ کل ہی چار ہزار روپیہ کسی معتبر بینک میں جمع کر دیتا۔ سود سے اس کی پروش ہوتی رہتی۔ یہ شرط کر دیتا

کہ اصل میں سے اس کو کچھ نہ دیا جائے۔“

دفعتاً کمالاً پرشاد آنکھیں ملتے ہوئے آکر کھڑے ہوئے اور بولے۔ ”ابھی آپ سوئے نہیں۔ گرمی لگتی ہے تو پکھا لا کر رکھ

دوں۔ رات زیادہ ہو گئی۔“

بدری۔ ”نہیں گرمی نہیں ہے۔ پر میا سے کچھ باتیں کرنے لگا تھا۔ تم سے بھی کچھ صلاح لینا چاہتا تھا۔ تم آپ ہی آپ آگئے۔ میں سوچتا ہوں پورنا یہیں آکر رہے تو کیا ہرج ہے۔“

کملہ پرشاد نے آنکھیں پھاڑ کر کہا ”یہاں اماں نہ راضی ہوں گی۔“

بدری۔ ”اماں کی بات چھوڑ دو۔ تمھیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔“

کملہ پرشاد نے زور دے کر کہا ”میں تو کبھی صلاح نہ دوں گا۔ دنیا میں سبھی طرح کے آدمی ہیں۔ نہ جانے لوگ کیا سمجھیں۔

ذرادور تک سوچیے۔“

بدری۔ ”اس کی پروش کے لیے تو کوئی نہ کوئی انتظام کرنا ہی ہو گا۔“

کملہ۔ ”ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

بدری۔ ”تو اور کون کرے گا۔“

کملہ۔ ”شہر میں ہمیں تو نہیں ہیں؟ اور بہت سے مالدار لوگ ہیں۔ اپنی حیثیت کے مطابق ہم بھی کچھ امداد کریں گے۔“

بدری پرشاد نے تمسخر کرتے ہوئے کہا ”تو چندہ کھول دیا جائے۔ کیوں؟ اچھی بات ہے تو جاؤ گھوم گھوم کر چندہ وصول کرو۔“

کملہ۔ ”میں کیوں چندہ جمع کرنے لگا۔“

بدری۔ ”تب کون کرے گا؟“

کملہ پرشاد نے اس معاملہ میں مطلق غور نہ کیا تھا۔ بدلتی سے بولا۔ ”آخر آپ نے کوئی تجویز تو سوچی ہو گی جو مناسب

سمجھیے وہ کیجیے۔“

بدری۔ ”میں کیا کروں گا۔ میری تجویز کی اب وقعت ہی کیا ہے۔ چراغ سحری ہوں۔ میری زندگی کا کیا ٹھکانا۔ آج مر اکل

دوسرادن۔ میری آنکھیں بند ہوتے ہی تم سب درہم کرڈا لو تو مفت میں اور بدنامی ہو۔“

کملہ پرشاد نے بہت رنجیدہ ہو کر کہا ”آپ مجھے اتنا کمینہ خیال کرتے ہیں یہ مجھے معلوم نہ تھا۔“

بدری پرشاد بیٹھے کو بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ میری باتوں سے اسے صدمہ پہنچا ہے، انھوں نے فوراً بات

ہٹائی۔ ”نہیں نہیں میں تمھیں کمینہ نہیں سمجھتا۔ بہت ممکن ہے کہ آج ہم جو بات کر سکتے ہیں وہ کل کے حالات تبدیل ہو جانے کے بعد نہ کر سکیں۔“

کملہ۔ ”المیشور نہ کرے کہ میں وہ مصیبت جھیلنے کے لیے بیٹھا رہوں۔ لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ جو کچھ کر جائیں گے،

اس میں کملا پرشاد کو بھی کسی حالت میں اعتراض نہ ہوگا۔ آپ گھر کے مالک ہیں۔ آپ ہی نے یہ دولت پیدا کی ہے۔ آپ کو اس پر پورا اختیار ہے۔ تجویز کرنے کے پیشتر میں جو چاہے کہوں۔ جب آپ ایک بات طے کر دیں گے تو میں اس کے خلاف زبان نکلنے ہلاوں گا۔“

بدری۔ ”تو کل چار ہزار روپے پورنا کے نام بینک میں جمع کر دو اور یہ شرط لگا دو کہ وہ اصل میں سے کچھ نہ لے سکے۔ اس کے بعد روپے ہمارے ہو جائیں گے۔ کملا کو گویا چوٹ سی لگی۔ بولے ”خوب سوچ لجیئے۔“

بدری پرشاد نے تصفیہ کے لجھ میں کہا ”خوب سوچ لیا ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ اسے منظور کرتی ہے یا نہیں۔“

کملا۔ ”کیا اس کی منظوری میں بھی کوئی شرط ہے۔“

بدری پرشاد نے خواتت آمیز بھی میں کہا ”تمہاری یہ ب瑞 عادت ہے کہ تم سب کو خود غرض سمجھنے لگتے ہو۔ کوئی شریف آدمی دوسروں کا احسان سر پر نہیں لینا چاہتا۔ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے۔ گئے گذروں کی بات جانے والیں جس میں خودداری کا ذرا بھی شاہد ہے وہ دوسروں سے مد نہیں لینا چاہتے۔ مجھے تو شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ پورنا کبھی اس پر رضا مند نہ ہوگی۔ وہ محنت کرے گی لیکن جب تک مجبور نہ ہو جائے ہماری مدد و قبول نہ کرے گی۔ پرمیانے بڑے جوش سے کہا ”مجھے بھی یہی شبہ ہے۔ راضی ہو گی بھی تو بڑی مشکل سے۔“

بدری۔ ”تم اس سے اس کا ذکر کرنا۔ کل ہی۔“

پرمیان۔ ”نہیں دادا، مجھ سے نہ بنے گا۔ وہ اور میں دونوں ہی اب تک بہنوں کی طرح رہی ہیں۔ مجھ سے اس طرح کی گفتگو اب کیسے ہو گی۔ میں تورو نے لگوں گی۔“

بدری۔ ”تو میں ہی طے کرلوں گا۔ ہاں کل شاید مجھے فرصت نہ ملے، تب تک تمہاری اماں سے با تین ہوں گی۔ میرا خیال ہے وہ راضی ہو جائیں گی۔“

کملا پرشاد خانہ داری کے انتظام میں اپنے کولاٹانی سمجھتے تھے۔ یوں تو عقل میں وہ اپنے کو افلاطون سے ترقی بھر کم نہ سمجھتے تھے، لیکن خانہ داری میں تو ان کا کمال مسلمہ تھا۔ سینما روز دیکھتے تھے مگر کیا مجال جو جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ کریں۔ منجر سے دوستی کر رکھی تھی۔ اس کے یہاں کبھی کبھی دعوت کھا آیا کرتے تھے۔ پیسوں کا کام دھیلوں میں نکالتے تھے اور بڑی خوب صورتی سے کبھی کبھی لا لہ بدری پرشاد سے اس معاملہ میں ان کی ٹھنڈی بھی جایا کرتی تھی۔ بوڑھے لا لہ جی میٹھے کی اس تنگ دلی پر کبھی کبھی کھری کھری کہہ ڈالتے تھے۔ کملا پرشاد سمجھ گئے کہ لا لہ جی اس وقت کوئی اعتراض نہ سنیں گے بلکہ اعتراف سے ان پر الٹا ہی اثر پڑے گا۔

اس لیے انھوں نے مصلحت سے کام لینے کا ارادہ کیا۔ علی الصباح پورنا کے دروازے پر جا کر آواز دی۔ پورنا پہلے تو ان سے پرداہ کرتی تھی مگر اب بہو بن کر بیٹھنے سے کام نہ چل سکتا تھا۔ انھیں اندر بلا لیا، کملا با باؤ اندر جا کر چار پائی پر بیٹھے۔ ایک لمحہ میں پورنا ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ پورنا کی پیشانی گونگھ سے ڈھکی ہوئی تھی لیکن دونوں نم آنھیں تشكیر سے بھری ہوئی زمین کی طرف تک رہی تھیں۔

کملہ اسے دیکھ کر سکتے میں آگیا۔ وہ اس ارادے سے آیا تھا کہ اسے کسی طرح سے یہاں سے ٹال دوں۔ میکے چلے جانے کی تحریک کروں۔ اسے اس کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی کہ آئندہ اس بے کس کا کیا حشر ہوگا۔ اس کی گذر بسر کیسے ہوگی۔ اس کی حفاظت کون کرے گا۔ وہ اس وقت اپنے یہاں سے ٹال کر اپنے سر کا بوجھ ہٹا دینا چاہتا تھا لیکن اس یوہ کی بھولی بھالی معصوم صورت دیکھ کر اس تنگدلی پر غیرت آئی۔ کون آدمی ایسا سنگ دل ہے جو کسی مل نازک کو توڑ کر بھاڑ میں جھونک دے۔ زندگی میں پہلی بار اس کا دل حسن سے متاثر ہوا۔ اندھیرے گھر میں چاغ جل اٹھا۔ تمھیں اب یہاں اکیلے رہنے میں بڑی تکلیف ہوگی، ادھر پر یہاں بھی اکیلی گھبرا یا کرتی ہے، اگر تم بھی جا کر اس کے ساتھ رہو تو کیا ہرج ہے۔“

پورنا سر نیچا کیے ایک لمحہ تک سوچنے کے بعد بولی ”ہرج کیا ہے یہاں بھی تو آپ ہی لوگوں کے بھروسے پر پڑی ہوں؟“

کملہ۔ ”تو آج چلی چلو، بابو جی کی بھی یہی خواہش ہے، میں جا کر آدمیوں کو اسباب لے جانے کے لیے بھیج دیتا ہوں۔“

پورنا۔ ”نہیں بابو جی، اتنی جلدی نہ کیجیے۔ سوچ لینے دیجیے۔“

کملہ۔ ”اس میں سوچنے کی کون تی بات ہے۔ یہاں اکیلی کیسے پڑی رہو گی؟“

پورنا۔ ”اکیلی تو نہیں ہوں۔ مہری بھی نہیں سونے کو کہتی ہے۔“

کملہ۔ اچھا! وہ بلو، ہاں بڑھیا ہے تو سیدھی مگرڑی ہے۔ آخر میرے گھر چلنے میں تمھیں کیا پس و پیش ہے۔

پورنا۔ ”کچھ نہیں۔ پس و پیش کیا ہے۔“

کملہ۔ ”تو آدمیوں کو جا کر بھیج دوں؟“

پورنا۔ بھیج دیجیے گا ابھی جلدی کیا ہے؟

کملہ۔ ”تم ناخن اتنا سوچا کرتی ہو، پورنا! کیا تم سمجھتی ہو کہ تمھارا جانا میرے گھر کے اور لوگوں کو بر امعلوم ہو گا؟“

کملہ کا قیاس درست نکلا۔ پورنا کو واقعی یہی اعتراض تھا۔ مگر وہ لحاظ کے سبب اسے ظاہر نہ کر سکتی تھی۔ اس نے سمجھا بابو جی

نے میرے دل کی بات تاڑلی۔ اس سے وہ نادم ہوئی۔ بابو صاحب کے گھر والوں کے متعلق ایسا خیال اسے نہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر

کملہ پرشاد نے اس کے پس وپیش کا خاتمہ کر دیا۔ بولے۔ ”تمہارا یہ خیال بالکل مدرتی ہے پورنا۔ مگر سوچو، میرے مکان میں ایسا کون سا آدمی ہے جو تمہاری مخالفت کر سکے۔ با بوجی کی خود ہی یہ خواہش ہے۔ مجھے تم خود ہی جانتی ہو۔ پنڈت بنت کمار سے میری کتنی گھری دوستی تھی۔ یہ تم سے پوشیدہ نہیں۔ پر یہا تمہاری سیلی ہی ہے۔ با بوجی کو تم سے کتنی محبت ہے، تم یہ جانتی ہو، رہ گئی سومترا اسے ذرا برا لگے گا۔ تم سے کوئی پرانہیں مگر اس کی پرواہ کون کرتا ہے۔ اسے خوش رکھنے کا بھی تمھیں ایک گرتائے دیتا ہوں۔ کبھی کبھی یہ منتر پڑھ دیا کرنا۔ وہ تمہاری برائی نہ کرے گی۔ بس اس کی خوبصورتی کی تعریف کر دینا۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ تعریف کرنے سے وہ سمجھ جائے گی کہ یہ مجھے بنا رہی ہے۔ تم چاہے جتنا سرا ہو، وہ اسے ٹھیک ہی سمجھے گی۔ اسی منظر سے میں اسے نچالیا کرتا ہوں۔ وہی منظر تمھیں بتائے دیتا ہوں۔“

پورنا کو ٹھیک آگئی بولی ”آپ تو ان کی ٹھیک اڑا رہے ہیں۔ بھلا ایسا کون ہو گا جسے اتنی سمجھنا ہو۔“

کملہ۔ اتنی سمجھ کو تم معمولی بات سمجھ رہی ہو۔ تم کو یہ سن کر تعجب ہو گا۔ مگر اپنی تعریف سن کر ہم اتنے متواലے ہو جاتے ہیں کہ پھر ہم میں اچھا براسمجھنے کی تمیز ہی نہیں رہ جاتی۔ بڑے سے بڑا مہاتما بھی اپنی تعریف سن کر خوشی سے پھول اٹھتا ہے۔ ہاں تعریف کرنے والے کے لفظوں میں بھلگت (عقیدت) کی جھلک ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شعرا کو جھوٹی تعریفوں کے پل باندھنے کے لیے راجہ مہاراجے انعام و اکرام کیوں دیتے۔ بتاؤ راجا صاحب طمنجہ کی آواز سن کر چوک پڑتے ہیں۔ کانوں میں انگلی ڈال لیتے ہیں اور گھر میں بھاگتے ہیں۔ مگر دربار کا شاعر شجاعت میں ارجمن اور درونا چاریہ سے دو ہاتھ اور انچا اٹھا دیتا ہے تو راجا صاحب کی باخچیں کھل جاتی ہیں۔ انھیں مطلق یہ خیال نہیں ہوتا کہ میرا منحکہ اڑایا جا رہا ہے۔ ایسی تعریفوں میں ہم الفاظ کو نہیں، ان کے چھپے ہوئے جذبات کو دیکھتے ہیں۔ سمعت ارگ روپ میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتی۔ اسے نہ جانے یہ خط کیسے ہو گیا۔ یہ کہتے ہوئے بہت رنج ہوتا ہے۔ مگر ایسی عورت کے ہاتھوں میری زندگی خراب ہو گئی۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا کہ محبت کے کہتے ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ بد نصیب آدمی ہوں۔ شاید پچھلے جنم کے گناہوں کا پراشچلت کر رہا ہوں۔ سمعت اسے بولنے کو جی نہیں کرتا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہتا کہ گھر میں کھرام نہ چج جائے۔ لوگ سمجھتے ہیں میں آوارہ ہوں۔ تفریح کے لیے سینما اور تھیٹر جاتا ہوں لیکن میں تم سے چ کہتا ہوں پورنا میں ان تماشوں میں محض اپنے درد دل کو بہلانے کے لیے جاتا ہوں۔ اپنی گرسنہ آرزوؤں کو اور کیسے سمجھاؤں۔ دل کی آگ کو کیسے بجھاؤں۔ کبھی کبھی جی میں آتا ہے کہ سینما سی ہو جاؤں اور شاید، ایک دن مجھے..... میہی کرنا پڑے گا۔ تم سمجھتی ہو گی یہ حضرت کہاں کا گچھڑا لے بیٹھے۔ معاف کرنا۔ نہ جانے میں آج کیوں تم سے یہ تذکرہ کرنے لگا۔ آج تک میں نے ان خیالات کو کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔ حضرت نصیب دل ہی سے ہمدردی کی امید ہوتی ہے۔ بس یہ سمجھو، تو میں جا کر آدمیوں کو سچی دیتا ہوں۔ تمہارا اسباب

اٹھا لے جائیں۔ پورنا کو اب کیا عذر ہو سکتا تھا۔ اس کا جی اب بھی گھر چھوڑنے کو نہ چاہتا تھا لیکن اب وہ اس تحریک کو نہ ٹال سکی۔ اسے یہ خوف بھی ہوا کہ میرے انکار سے ان کو ملال نہ ہو۔ اس بے کس کے لیے اس وقت تنکے کا سہارا بھی بہت تھا، تو جلا اس کشتنی کو کیسے تغیری سمجھتی۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ وہ اسے پار لے جانے والی کشتی نہیں بلکہ ایک خوفناک دریائی جانور ہے جو اس کی روح کو نکل جائے گا۔

(5)

پورنا کو اپنے گھر سے نکلتے وقت بہت رنج ہونے لگا۔ اس نے اپنی باسرت زندگی کے تین سال اسی گھر میں کاٹے تھے۔ یہیں سہاگ کے سکھ دیکھے۔ یہیں رنڈاپے کے دکھ بھی دیکھے۔ اس گھر کو چھوڑتے اس کا دل پھٹتا جاتا تھا۔ جس وقت چاروں کھار اس کا اسباب اٹھانے کے لیے گھر میں آئے تو کیا یک روپڑی۔ اس کے دل میں کچھ ایسے جذبات پیدا ہو گئے جیسے نعش کے اٹھاتے وقت سوگ کرنے والوں کے دل میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نعش گھر میں نہیں رہ سکتی اور جتنی جلدی اس کا کفن دفن ہو جائے اتنا ہی اچھا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے اس کی محبت کے جوش میں آکر اس کے پاؤ سے لپٹ جاتے ہیں اور پابوسی سے پاگل ہو کر ہلا دینے والی آواز میں روپڑتے ہیں۔ یہ گمان بالٹ کہ شاید لاش میں زندگی کے کچھ آثار باقی ہوں، ایک پرودہ کی طرح آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جاتا ہے اور دنیاوی محبت کا آخری رشتہ شکست ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پورنا بھی مکان کے ایک گوشہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ اپنے پیارے سوامی کی یادگار کا یہ سہارا بھی رنج کے بھر بے کراں میں غائب ہو گیا۔ اس مکان کا ایک ایک گوشہ اس کے لیے دل کش یادگاروں سے مملو تھا، سہاگ کے سورج کے غروب ہو جانے پر بھی یہاں اس کی کچھ چک نظر آتی تھی۔ سہاگ کے سہانے گیت کے ختم ہو جانے پر بھی یہاں اس کی گونج اٹھ رہی تھی۔ اس مکان میں ادھرا دھر چلتے ہوئے اسے اپنے سہاگ کا دکھ بھرا گھمنڈ محسوس ہوتا رہتا تھا۔ آج اس سورج کی آخری چمک مٹی جاری تھی۔ آج اس گیت کی وہ گونج ایک غیر محدود خلا میں ڈوبی جاتی تھی۔ آج گھمنڈ دل کو چیر کر نکلا جا رہا تھا۔

پڑوں کی عورتوں کو جب معلوم ہوا کہ پورنا یہاں سے جا رہی ہے تو سب اسے رخصت کرنے آئیں۔ پورنا کے اخلاق و اعسار نے سبھی کے قلوب کو مختصر کر لیا تھا۔ پورنا کے پاس دولت نہ تھی مگر میٹھی باتیں تھیں۔ بنشاش چپڑہ تھا۔ ہمدردی تھی۔ خدمت گزاری تھی جو دولت کی بہ نسبت کہیں زیادہ تیقیتی جواہر ہیں اور جن کی ضرورت لوگوں کو دولت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ پورنا ان سبھوں سے گلے مل کر رخصت ہوئی، گویا لڑکی سر اس جاتی ہو۔ شام کے وقت وہ اپنی مہری بلو کے ساتھ روتی ہوئی اس طرح چلی گویا کوئی جلاوطن ہو۔ پیچھے مژمر کراپنے پیارے گھر کو دیکھتی جاتی تھی۔ گویا اس کا دل وہیں رہ گیا ہو۔

پرمیا اپنے دروازے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پورنا کو دیکھتے ہی دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ اس گھر میں پورنا عموماً روز ہی آیا کرتی تھی۔ بیہاں آتے ہی اس کا دل خوش ہو جاتا تھا۔ ہنسی کھیل میں وقت کٹ جاتا تھا مگر آج اس گھر میں قدم رکھنے میں پس و پیش ہو رہا تھا۔ شاید وہ پچھتا رہی تھی کہ نا حق ہی آئی۔ پرمیا کے گلے کر بھی اس کا دل خوش نہ ہوا تب وہ سہیلی کی حیثیت سے آتی تھی۔ آج وہ ان کی دست مگر بن کر آئی تھی۔ جب اس کا آنا معمولی بات تھی۔ اس کی کوئی خاص آؤ بھگت نہ ہوتی تھی۔ لوگ اس کی پیشوائی کے لیے نہ دوڑتے تھے۔ آج اس کے آتے ہی دیو کی مودی خانہ کا دروازہ کھلا چھوڑ کر نکل آئی۔ سمترا اپنے بال گھنٹا رہی تھی۔ آدھی گتھی ہوئی چوٹی پر آنچل ڈال کر بھاگی۔ مہریاں اپنے اپنے کام چھوڑ کر نکل آئیں۔ کملا پرشاد پہلے ہی آنکن میں کھڑے تھے۔ لالہ بدربی پرشاد سندھیا کرنے جا رہے تھے۔ اسے ملتی کر کے آنکن میں آپنچے۔ یہ خاطرداریاں دیکھ کر پورنا کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس دل جوئی کا باعث اعزاز نہیں رحم تھا۔

دیو کی کو سمتر اکی کوئی بات نہ بھائی تھی۔ اس کا بہننا، بولنا، چلتا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، پہننا، اوڑھنا، سمجھی انھیں پھوہڑ پن کی انتہائی حد سے تجاوز کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور وہ ہمیشہ اس کی سخت تقدیر کرتی رہتی تھیں۔ ان کی تقدیروں میں محبت اور بزرگانہ نصیحت کارنگ کھلایا منافر کا، اس کا فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ سمتر اتو اسے منافر تھی۔ سمجھتی تھی اس لیے وہ انھیں اور بھی چڑھاتی رہتی تھی۔ دیو کی سویرے اٹھنے کی تاکید کرتی تھی۔ سمتر اپھروں دن چڑھے اٹھتی۔ دیو کی گھونگھٹ نکالنے کو کہتی تھی۔ سمتر اس کے جواب میں آدھا سرکھلار کھتی تھی۔ دیو کی مہریوں سے احتراز کرنے کی تعلیم دیتی تھی، سمتر امہریوں سے ہنسی دل گلی کرتی رہتی تھی۔ دیو کی کو پورنا کا بیہاں آنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ سمتر اسے بھاگ پگئی۔ پہلے ہی سے اس نے شوہر کی اس تجویز پر ناک سکیٹی تھی۔ یہ جان کر کہ یہ تجویز پوری ہو کر رہے گی، اس نے اس سے اختلاف کر کے اپنچس (اپ لیش) لینا مناسب نہ سمجھا تھا۔ وہ ساس کے دل کارنگ سمجھ رہی تھی۔ یہ بھی جانتی تھی کہ پورنا بھی سمجھ رہی ہے۔ اس لیے پورنا سے اسے محبت اور ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اب تک دیو کی پورنا کو دکھا کر سمتر اکو شرمندہ کرنا چاہتی تھی اس لیے سمتر اپورنا سے جلتی تھی۔ آج دیو کی پورنا سے بے اعتمانی کر رہی تھی اس لیے سمتر اکا اس سے بہنا پا ہو جاتا لازم ہو گیا۔ پورنا آج بھی بہت دری تک پریما کے پاس نبیٹھی۔ دل بہت ادا س تھا۔ آج اسے اپنی حالت کا اندازہ ہوا تھا۔ اتنی جلدی اس کی حالت کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ یہ آج اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ یہ گھر اس کے کھر میل والے گھر سے کہیں زیادہ آرام دہ تھا۔ اس کے کمرے میں فرش تھا، چارپائی تھیں، الماریاں تھیں، برقی روشنی تھی، پنچھا تھا، مگر اس وقت بجلی کی روشنی اس کی آنکھوں میں چھپ رہی تھی اور عینکے کی ہوا شعلہ کی طرح جسم کو جھلسائے ڈلتی تھی۔ پریما کے بہت اصرار کرنے پر بھی وہ آج کچھ نہ کھا سکی۔ تقدیر اس کے ساتھ کیسا کھیل کھیل رہی تھی۔ اس کے سرتاج کو اس کے ہاتھ سے چھین کر اب اس کو کھلونے سے خوش کرنا چاہتی تھی۔ اس کی دونوں

آنکھیں پھوڑ کر اسے سہانے منتظر کی سیر کر رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ کاٹ کر جل بہار کرنے کے لیے اتحاہ سمندر میں ڈھکیل رہی تھی۔ گیارہ نئے گئے تھے۔ پورنا روشنی سے آنکھیں ہٹا کر تاریکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس گہری تاریکی میں اسے کتنے خوش نما منتظر نظر آرہے تھے۔ وہی اپنا کچر میں کامکان تھا۔ وہی پرانی چار پائی تھی۔ وہی چھوٹا سا ٹھکن تھا اور اس کے شوہر دفتر سے آ کر اس کی طرف ہنتے ہوئے اور محبت بھری نگاہوں سے تاکتے ہوئے جیب سے کوئی چیز نکال کر دکھاتے اور چھپا لیتے تھے۔ وہ بیٹھی ہوئی پان لگا رہی تھی۔ جھپٹ کر اٹھی اور شوہر کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولی ”دکھا دو کیا ہے؟“ شوہر نے مٹھی بند کر لی، اس کی دلچسپی اور بڑھی۔ اس نے خوب زور لکا کر مٹھی کھو لی۔ مگر اس میں کچھ نہ تھا، آہ، آج اس کھیل، اس چھپیڑ چھاڑ میں اسے اپنی زندگی کی تفسیر چھپی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

دفعتاً سمتر انے آکر پوچھا ”ارے تم وہاں کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو۔ میں نے سمجھا تھا تمھیں نیندا آگئی ہو گئی۔“

پورنا نے آنسو پوچھ ڈالے اور سنبھل کر کہا ”یہ تو تم جھوٹ کہتی ہو بہن۔ یہ سوچتیں تو تم آتیں کیوں؟“

سمتر انے بلنگ پر بیٹھے ہوئے کہا ”سوچا تو یہی تھا مجھ کہتی ہوں، مگر نہ جانے کیوں چلی آئی۔ شاید تمھیں سوتا کھل کر لوٹ جانے ہی کے لیے آئی تھی، سچ کہتی ہوں۔ اب لیٹونا رات تو بہت ہو گئی۔“

پورنا نے کچھ متھکر ہو کر پوچھا ”اب تک تم کیسے جاگ رہی ہو؟“

سمتر ا۔ تمام دن سویا جو کرتی ہوں۔

پورنا۔ تو کیوں سوتی ہو تمام دن؟

سمتر ا۔ یہی رات کو جانے کے لیے۔

سمتر اہنسنے لگی، ایک لمحہ میں یکا یک اس کا چہرہ سنجدہ ہو گیا۔ بولی ”اپنے ماں باپ کی زر پرستی کا پراٹھخت کر رہی ہوں بہن اور کیا، یہ کہتے کہتے وہ آبدیدہ ہو گئی۔“

پورنا یہ سن کر متھکر ہو گئی۔ اس کی زندگی کے نغمہ شیریں میں یہ کرخت آواز کیوں؟

سمتر اسکی اندرونی تکلیف سے بے قرار ہو کر بولی ”تم دیکھ لینا بہن! ایک روز یہ محل ڈھھہہ جائے گا۔ یہ بدعا میرے منہ سے بار بار لکھتی ہے۔“

پورنا نے تعجب سے کہا ”ایسا کیوں کہتی ہو بہن،“ پھر اسے ایک بات یاد آگئی، پوچھا، ”کیا ابھی بھیا جی نہیں آئے۔“

سمتر ا دروازے کی طرف خوف زدہ نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

”ابھی نہیں، بارہ ہی تو بے ہیں، اتنی جلدی کیوں آئیں گے؟ نہ ایک، نہ دو، نہ تین۔ میرا بیاہ تو اس محل سے ہوا ہے۔ لالہ بدری پرشاد کی ہبو ہوں۔ اس سے زیادہ سُنھ کا خیال کون کر سکتا ہے؟ بھگوان نے کس لیے مجھے جنم دیا، سمجھ میں نہیں آتا۔ اس گھر میں میرا کوئی اپنا نہیں ہے بہن! میں زبردستی پڑی ہوئی ہوں۔ میرے مرنے جیسے کسی کو پروادا نہیں ہے۔ تم سے یہی انتباہ ہے کہ مجھ پر رحم کرنا۔ ٹوٹے ہوئے تاروں سے میٹھے سر نہیں نکلتے تھے۔ تم سے نہ جانے کیا کیا کہوں گی۔ کسی سے کہہ نہ دینا، نہیں تو اور مصیبت میں پھنس جاؤں گی۔ ہم دونوں دکھیا ہیں۔ تمہارے دل میں میٹھی یادیں ہیں، میرے دل میں وہ بھی نہیں۔ میں نے سکھ دیکھا ہی نہیں، اور نہ دیکھنے کی امید ہی رکھتی ہوں۔“

پورنا نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا ”میری تقدیر سے اپنی تقدیر کا مقابلہ نہ کرو بہن، دست گفری سے بڑی مصیبت بد نصیبی کے خزانے میں بھی نہیں ہے۔“

سمتر اسکھی نہیں کر بولی۔ ”وہ مصیبت کیا میرے سر نہیں ہے بہن! اگر مجھے کہیں ٹھکانا ہوتا، اس گھر میں لمحہ بھی نہ رہتی۔ سینکڑوں پار والدین کو لکھ چکی ہوں کہ مجھے بلا لو میں عمر بھر تمہاری خدمت کرتی رہوں گی۔ مگر انہوں نے بھی میری طرف سے اپنا دل سخت کر لیا ہے۔ جواب میں نصیحتوں کا ایک دفتر آ جاتا ہے، جسے میں کبھی نہیں پڑھتی۔ اس گھر میں صرف میرے سر ہیں جنہیں ایشور نے دل دیا ہے۔ اور سب کے سب پتھر کے دیوتا ہیں۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں بہن! مجھے اس کارنچ نہیں ہے کہ یہ حضرت کیوں اتنی رات گئے گھر کو آتے ہیں یا ان کا دل کسی اور سے اکٹا ہوا ہے۔ اگر آج مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ کسی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں تو میری آدمی تکلیف مٹ جائے۔ میں موسلوں سے ڈھوں جاؤں۔ مجھے تو یہ رونا ہے کہ ان کے دل ہی نہیں بلکہ دل کی جگہ خود غرضی کا ایک روڑا رکھا ہوا ہے۔ نہ کتابوں سے دلچسپی، نہ گانے سے نہ کھیل سے۔ دلچسپی ہے صرف پیسے سے! مجھے تو یقین نہیں کہ انھیں سینیما میں مزہ آتا ہوگا، وہاں بھی کوئی غرض ہے لیں دین، سوائے ڈیوڑھے، گھاٹے، نفع میں ان کی جان بسی رہتی ہے اور مجھے ان باتوں سے نفرت ہے۔ کمرے میں آتے ہیں تو پہلی بات جوان کے منہ سے نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ بتی ابھی تک کیوں نہیں بجھائی۔ وہ دیکھو سواری آگئی۔ اب گھنٹہ دو گھنٹے کفایت کی نصیحت سننی پڑے گی۔ یوں میں روپے کو بیچ نہیں سمجھتی۔ جمع کرنا اچھی بات ہے مگر یہ کیا، کہ آدمی روپے کا غلام ہو جائے۔ صرف انھیں چڑھانے کے لیے کچھ نہ کچھ فضول خرچی کیا کرتی ہوں۔ مزا تو یہ ہے کہ انھیں اپنے ہی پیسوں کی ماکھ نہیں ہوتی، میں اپنے پاس سے کچھ خرچ نہیں کر سکتی! پتا جی (والد صاحب) مہینے میں چالیس پچاس روپے بیچ دیتے ہیں۔ ورنہ اس گھر کی کافی کوڑی نہ ملے۔ میری جو خواہش ہوتی ہے، کرتی ہوں۔ سو وہ بھی آپ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس پر بھی کئی بار بھگڑا ہو چکا ہے۔ سونے لگانا تو متنی بجھا دینا۔ بہن جاتی ہوں۔“

سمرا چلی گئی۔ پورنا نے بتی بجھادی اور لیٹی۔ مگر نیند کہاں؟ آج ہی اس مکان میں قدم رکھا تھا اور آج ہی اس کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہو رہا تھا۔ یقینی تھا کہ وہ بہت دن یہاں نہ رہے گی۔

### (6)

لالہ بدری پرشاد کے لیے امرت رائے سے اب کوئی واسطہ رکھنا غیر ممکن تھا۔ شادی تو دوسری بات تھی، سماج میں اتنی زبردست بداخلاقی کا مسوید بن کر امرت رائے نے خود کو ان کی نظرؤں سے گردادیا تھا۔ ان سے اب کسی قسم کا تعلق پیدا کرنا بدری پرشاد کے لیے ذات کی بات تھی۔ امرت رائے کے بعد دن ناتھ سے بہتر شخص انھیں کوئی اور نظر نہ پڑا۔ زیادہ پرش و چبو کرنے کا اب موقع بھی نہ تھا۔ امرت رائے کے انتظار میں پہلے ہی بہت دری ہو چکی تھی۔ برادری میں لوگ اگشت نمائی کرنے لگے تھے۔ نئے شخص کی جگتو میں شادی کے ایک غیر معمین وقت تک مل جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے دل کو ادھر ادھرنہ دوڑا کر انھوں نے دن ناتھ ہی کے ساتھ عقد پختہ کرنے کا تھیہ کر لیا، دیوکی نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ پریمانے اس معاملہ میں لاپرواہی ظاہر کی۔ اب اس کے لیے سبھی مرد برابر تھے اور ہر کسی کے ساتھ زندگی کا نبہ کر سکتی تھی۔ اس کی چلتی تو وہ دو شیزہ ہی رہنا پسند کرتی۔ مگر جوان لڑکی بیٹھی رہے یہ خاندان کے لیے بدنامی کی بات تھی۔ اس معاملے میں وہ کسی قسم کی بے جا صدر کے والدین کا دل نہ دکھانا چاہتی تھی۔

جس دن امرت رائے نے وہ زبردست عہد کیا۔ اسی دن پریمانے سمجھ لیا کہ اب زندگی میں میرے لیے سکھ کا خاتمه ہو گیا مگر بن بیاہ کر اپنا مصلحہ کرانے کی بہ نسبت کسی کی ہو کر رہنا کہیں زیادہ بہتر تھا۔ آج سے دو تین برس قبل دن ناتھ ہی سے اس کے بیاہ کی بات چیت ہو رہی تھی۔ اسے وہ جانتی ہی تھی۔ درمیان میں حالات تبدیل نہ ہو گئے ہوتے تو آج وہ دن ناتھ کے گھر میں ہوتی۔ دن ناتھ کو وہ کئی بار دیکھ بھی چکی تھی۔ اس میں محبت ہے، شرافت ہے، علیمت ہے، یہ باتیں اسے معلوم تھیں، ان کی نیک چلنی پر بھی کسی کو شبہ نہ تھا۔ وہ دیکھنے میں بھی بہت بچے گھٹے آدمی تھے۔ برپچریہ (تجزہ) کی رونق چہرے پر نمایاں تھی۔ انھیں اس سے محبت تھی۔ یہ راز پریمانے مخفی نہ تھا۔ آنکھیں دل کے راز کو آشکار کر رہی دیتی ہیں۔ امرت رائے نے مذاق ہی مذاق میں پریمانے اس کا تذکرہ بھی کر دیا تھا۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی پریمانا کو ان کا اگر کچھ خیال تھا تو وہ اتنا ہی کہ وہ امرت رائے کے دلی دوست ہیں۔ ان میں بڑی محبت ہے۔ وہ دولت مندنیں تھے مگر یہ کوئی عیب نہ تھا، کیوں کہ پریمانا شوقین نہ تھی۔ کیوں اس کا دل امرت رائے کی طرف رجوع ہوتا تھا۔ اس کا کوئی خاص سبب اس کو نہ معلوم تھا۔ مگر ایسی حالت میں اس کے لیے کوئی اور تمدیر نہ تھی۔ اب تک اس نے دن ناتھ کو کبھی اس نگاہ سے نہ دیکھا تھا۔ مگر اب دل میں وہ جگہ خالی ہو جانے کے بعد دن ناتھ کو اس میں بٹھانے میں اسے

تکلیف نہ ہوئی۔ اس نے دل کو شوول کر دیکھا تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دان ناتھ سے محبت بھی کر سکتی ہے۔ بدری پرشاد شادی کے معاملے میں اس کی رضامندی ضروری سمجھتے تھے۔ پریما تیار تھی۔ اس لیے دان ناتھ کے پاس پیغام بھیج دیا۔

دان ناتھ اب بڑے شش و پیٹھ میں پڑے۔ یہ پیغام پاتے ہی انھیں خوشی سے پھول اٹھنا چاہیے تھا۔ مگر یہ بات نہ ہوئی۔ انھیں اپنی منظوری لکھ بھینچ میں ایک ہفتہ سے زائد لگ گیا۔ طرح طرح کے اندر یہ ہوتے تھے۔ وہ پریما کو خوش رکھ سکیں گے؟ اس کے دل پر قابو پاسکیں گے؟ ایسا نہ ہو کہ زندگی و بال ہو جائے؟ ان کا دل ان سوالات کا بہت ہی تشنگی بخش جواب دیتا تھا۔ محبت میں اگر دل کو چینچنے کی طاقت ہے تو وہ ضرور کامیاب ہوں گے لیکن اخلاقی اعتبار سے انھیں اپنا طرز عمل دوستی ہی کے خلاف نہیں، شرافت کے خلاف بھی معلوم ہوتا تھا۔ اپنی جان سے زیادہ پیارے دوست کی بُنسی سے فائدہ اٹھانے کا خیال انھیں پریشان کر دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کا گھر جل رہا ہے اور وہ تاپ رہے ہیں۔ انھیں یقین تھا کہ پریما سے جتنی محبت مجھے ہے، اتنی امرت رائے کو نہیں ہے۔ اس کے بغیر انھیں اپنی زندگی خشک معلوم ہوتی تھی۔ ان کا میلان متاثل زندگی کی جانب تھا۔ خدمت کے جذبات ان کی فطرت میں نہ تھے۔ نام و نمود کی تمنا بھی نہ تھی۔ ایثار کا ذکر تو بہت دور کی بات تھی۔

بالآخر بہت غور و خوض کے بعد انھوں نے طے کیا ”ایک بار امرت رائے کو پھر شوونا چاہیے۔ اگر اب بھی وہ ان کی رائے تبدیل کر سکے تو عین خوشی کی بات ہوگی۔ زندگی کی مسرت تو تمہنا میں ہے۔ بالفرض یہ خواہش پوری ہوئی تو کوئی دوسرا آکھڑی ہوگی۔ جب ایک نہ ایک خواہش کا موجود رہنا یقینی ہے تو یہی کیوں نہ رہے، اس سے اور مسرت انگیز دوسرا کوئی خواہش ہو سکتی ہے؟ اس کے سو ایسا اندر یہی تو تھا کہ کہیں زندگی کا یہ ناٹک فراقتیہ نہ ثابت ہو۔ پہلی محبت کتنی لافانی ہوئی ہے اسے وہ خوب جانتے تھے۔ آج کل کالج تو بند تھا مگر دان ناتھ ”ڈاکٹر“ کے لقب کے لیے ایک نئی کتاب لکھ ہے تھے۔ کھانا کھا کر کالج چلے جاتے تھے۔ یہاں کتب خانے میں بیٹھ کر جتنی آسانیاں تھیں وہ مکان پر نہ ہو سکتی تھیں۔ آج وہ تمام دن کتب خانے میں بیٹھے رہے مگر نہ تو ایک حرفاً لکھا اور نہ ایک سطر پڑھی۔ انھوں نے مشکل کام کر ڈالنے کا آج تہیہ کر لیا تھا جسے وہ کئی روز سے ٹالتے آرہے تھے۔ کیا کیا باتیں ہوں گی، دل میں یہی سوچتے ہوئے وہ امرت رائے کے بنگلے پر جا پہنچے۔ آفتاب پھولوں اور پتیوں پر اپنی آخری برکت کی زریں بارش کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ٹم ٹم تیار کھڑی تھی مگر امرت رائے کا پتا نہ تھا۔ نوکر سے پوچھا تو معلوم ہوا کمرے میں ہیں۔ کمرے کے دروازے کا پردہ اٹھاتے ہی بولے ”بھلے آدمی، تمھیں گرمی بھی نہیں لگتی، یہاں سانس لیں مشکل ہے اور بیٹھے ہوئے تپیا کر رہے ہیں۔“

روشنی کی ایک باریک شعاع چلتی کے اندر جاتی ہوئی امرت رائے کے چہرے پر پڑی۔ دان ناتھ چونک پڑے، وہ چہرہ زرد

ہورہا تھا، آٹھ دس روز قبل جور و نقص تھی اس کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ گھبرا کر کہا ”یہ تمہاری کیا حالت ہے؟ کہیں تو نہیں لگ گئی؟ کیسی طبیعت ہے؟“

امر رائے نے دان ناتھ کو گلے لگاتے ہوئے کہا ”ایسا بھی کبھی ہوا ہے کہ تم نے مجھے دیکھ کر یہ کہا ہو، آج کل تم خوب تند رست ہو۔ تمھیں تو میں ہمیشہ ہی بیمار نظر آتا ہوں۔ ہر مرتبہ پیشتر سے زیادہ۔ جیتا کیسے ہوں، یہ ایشور ہی جانے مگر ذرا اپنی صورت تو دیکھو۔ دنیا بھر کے اصولوں کو چاٹے میٹھے ہو مگر اتنی نہیں ہو سکتا کہ شام کو سیر ہی کر لیا کرو۔“

دان ناتھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس ٹم ٹم ہوتی تو سارا دن دوڑتا۔ گھوڑا بھی یاد کرتا کہ کسی سے پالا پڑا تھا۔ پیادہ پا تو مجھے گھونمنے میں لطف نہیں آتا۔ تمھیں دنیا میں بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ جسم کی حفاظت کرو۔ تمھی نے دنیا کی نجات کا ٹھیکہ لیا ہے۔ یہاں کیا ایک روز چکے سے دنیا سے چل دینا ہے۔ چاہتا تو میں بھی ہوں کہ باقاعدہ زندگی بسر کروں مگر جب نہ جاوے تب تو۔ کتنی بارڈنڈ، مگر، ڈیل شروع کیا، مگر کیا کبھی نباہ سکا؟ آخر سمجھ گیا تند رستی میرے لیے ہے ہی نہیں، پھر اس کے لیے کیوں مفت حیران ہوں؟ اتنا جانتا ہوں کہ دائم الاریض لوگوں کی عمریں طویل ہوتی ہیں۔ تم ایک بار میریا کے موسم میں مرکے جیتے ہو۔ تمھیں بخار آتا ہے۔ سیدھا 106 درجہ تک جا پہنچتا ہے۔ مجھے ایک تو بخار آتا ہی نہیں، اور آیا بھی تو 101 درجے سے آگے بڑھنے کی ہمت ہی نہیں کرتا۔ دیکھ لینا تم مجھ سے پہلے رخصت ہو گے۔ حالاں کہ میری دلی تمنا یہی ہے کہ تمہاری گود میں میری جان نکلے۔ اگر تمہارے سامنے مروں تو میری یاد گار ضرور قائم کرنا۔ تمہاری یاد گار قائم کرنے والے تو بہت نکل آئیں گے مگر میری دوڑ تو تمھیں تک ہے! میری عظمت سے اور کون واقف ہے۔“

ان شرارت آمیز الفاظ میں مذاق کے ساتھ کتنا گاؤ، کتنی زبردست محبت بھری ہوئی تھی کہ دونوں ہی دوستوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ دان ناتھ مسکرا پڑے۔ مگر امرت رائے کا چہرہ متین ہو گیا۔ دان ناتھ ہنس کھم تھے مگر مذاق کا طرز سوز پاٹن کا پتا دے رہا تھا۔ امرت رائے نے پوچھا۔ ”لال بدربی پرشاد کے یہاں سے کوئی پیغام آیا؟ تم ادھر کئی روز سے دکھائی نہیں دیے۔ میں سمجھ گیا کہ وہاں اپنارنگ بھار ہے ہو گے اس لیے گیا بھی نہیں۔“

امر رائے نے اس معاملے کو چھیڑ کر دان ناتھ پر بڑا احسان کیا۔ ورنہ وہ یہاں گھنٹوں غپ شپ کرتے رہنے پر بھی وہ بات زبان پر نہ لاسکے۔ اب بھی ان کے بشرے سے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ تذکرہ فضول چھڑ گیا۔ بڑے تامل کے ساتھ بولے ”ہاں پیغام تو آیا ہے، مگر میں نے جواب دے دیا۔“

امر رائے نے گھبرا کر پوچھا ”کیا جواب دے دیا؟“

دان ناتھ - ”جو میرے جی میں آیا۔“

امر - ”آخر سنوں تو تمہارے جی میں کیا آیا؟“

دان ناتھ - ”یہی کہ مجھے منظور نہیں۔“

امر - ”یہ کیوں بھتی، کیا پر یہا تمہارے قابل نہیں؟“

دان ناتھ - ”نہیں یہ بات نہیں۔ میں خود اس کے قابل نہیں ہوں۔“

امر رائے نے تیز لمحہ میں کہا۔ ”اس کے قابل نہیں ہو تو اتنے دنوں سے اس کے لیے تپیا کیوں کر رہے ہو؟ میں درمیان میں نہ آپڑتا تو اس میں بھی کیا کوئی شہہ ہے کہ اس سے تمہارا عقد ہو گیا ہوتا؟ میں نے دیکھا کہ تم اس غم میں اپنی زندگی بر باد کیے ڈالتے ہو۔ تم نے کتنے ہی پیغام لوٹا دیے، حتیٰ کہ مجھے اس کے سوا کوئی چارہ کارنا رہا کہ میں تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں۔ مجھے اندر یہ ہوا کہ اس کی جدائی میں گھلتے گھلتے کہیں تم ایک دن مجھے تھا چھوڑ کر چلتا دھندا نہ کرو۔ میں نے اپنے دل کو ٹوٹا تو معلوم ہوا کہ میں اس صدمے کو برداشت کر سکتا ہوں، مگر تم نہیں برداشت کر سکتے۔ بھلے آدمی! تمہارے لیے تو میں نے اپنے دل پر اتنا بڑا جبر کیا اور اب تم کا وے کاٹ رہے ہو۔ اب اگر تم نے ذرا بھی چون وچرا کی تو میں ماری ڈالوں گا۔ سمجھ لینا۔ چپکے سے میری ٹھیٹ پر بیٹھو اور لاہہ بدری پر شاد کے پاس جا کر معاملہ طے کر آؤ۔“

دان ناتھ نے بر قی بٹن دباتے ہوئے کہا۔ ”تم اس کام کو جتنا آسان سمجھتے ہو اتنا آسان نہیں ہے، کم از کم میرے لیے۔“

امر رائے نے دوست کے چہرے کو محبت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ”میں یہ جانتا ہوں، بیشک آسان نہیں ہے۔ میں ہی رکاوٹ ڈالنے والا تھا۔ میں اب بھی ہوں لیکن تم جانتے ہو کہ میں نے ایک بار جوبات ٹھان لی۔ اب برہما بھی اتر آئیں تو مجھے مخحرف نہیں کر سکتے۔ پنڈت امر ناتھ کا کہنا میرے دل نہیں ہو گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پر یہا ہی نہیں کسی بھی دو شیزہ سے شادی کرنے کا حق مجھے نہیں ہے۔ ایشور نے وہ حق مجھ سے چھین لیا۔ پر یہا جیسی بیش بہا جنس کو پا کر چھوڑ دینے کا مجھے کتنا رنج ہو رہا ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں اور کچھ کچھ تم بھی جانتے ہو۔ مگر اس رنج میں خواہ میری جان ہی جاتی رہے جس کا کوئی امکان نہیں ہے، تو بھی اپنی اس زندگی میں پر یہا کو داخل نہ رہنے دوں گا۔ اب تم میری طرف سے مطمئن ہو گئے؟“

دان ناتھ اب بھی مطمئن نہ ہوئے تھے۔ ان کے دل میں ایک نہیں سیکڑوں رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں۔ یہ سمجھ کر کہ یہ نئی بات

سن کر امر رائے نہ پڑیں وہ خود نہ کر بولے۔ ”مجھے چھپرے کو پر یہا قبول کرے گی، یہ بھی خیال آیا ہے آجنبان کو؟“

امر رائے نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ”بھتی واہ کیا بات سوچی ہے، مانتا ہوں! ارے احقن داں، جب لاہہ بدری پر شاد نے

تمہارے بیہاں پیغام بھیجا تو سمجھ لو کہ انہوں نے پریما سے دریافت کر لیا ہے۔ ایسا کیے بغیر وہ کبھی پیغام نہ بھیجتے۔ اڑکی کو عالی تعلیم دینے کا کفارہ تو انھیں ادا کرنا ہی پڑتا ہے۔ چند باتوں میں تو وہ ہم لوگوں سے بھی زیادہ فراخ دل ہیں، اور چند باتوں میں ج blas سے بھی پست تر۔ پردے سے انھیں چڑھے ہے، یہ جانتے ہی ہو۔ بدھوا بواہ (بیاہ) ان کی آنکھوں میں بدرتین اخلاقی گناہ ہے۔ تمہارا یہ اندیشہ تو بے بنیاد ثابت ہوا۔ ہاں یہ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ پریما کو تم سے محبت نہ ہو۔ مگر ایسا خیال کرنا پریما کے ساتھ سخت نا انصافی کرنا ہے۔ وہ خاندانی رواج پر منٹنے والی بھی دیوی ہے۔ اس کی محبت کے معنی ہی ہیں ”شوہر پرستی“۔ محبت کی کسی دوسرا صورت سے وہ واقف ہی نہیں اور نہ شاید واقف ہوگی۔ مجھ سے اس کو اس لیے محبت تھی کہ وہ مجھے اپنا ہونے والا شوہر خیال کرتی تھی۔ پس اس کی محبت اس فرض شناسی پر محول ہے۔ ایسے فضول اندیشوں میں مفت دن گزار رہے ہو۔ سہا لگ نکل جائے گا تو پھر ایک سال امیدواری کرنی پڑے گی۔“  
دان ناتھ فکر میں ڈوب گئے۔ اگر چہ ان کے اعتراضوں کی تردید ہو چکی تھی، مگر اب بھی ان کے دل میں ایسی متعدد باتیں تھیں جنھیں وہ ظاہرنہ کر سکتے تھے۔ شک دلیل سے دور ہو جانے پر بھی بالکل مٹ نہیں جاتا۔ دوست سے بے وفائی کا خیال ان کے دل میں کچھ اس قدر چھپ کر بیٹھا ہوا تھا کہ اس پر کوئی حرہ کارگر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔  
دفعتاً امرت رائے نے گھنٹی بجائی۔ ایک بوڑھا آدمی سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ امرت رائے نے بدری پرشاد کے نام ایک خط لکھا اور دان ناتھ سے بولے۔ ”اس پر دستخط کرو۔“  
دان ناتھ دریپکہ کے سامنے کھڑے سگار پی رہے تھے۔ پوچھا۔

”کیسا خط؟“

امرت۔ ”پڑھ لو سامنے تو ہے۔“

دان۔ ”تم میری گردن پر چھبڑی چلا رہے ہو۔“

امرت۔ ”بس چپکے سے دستخط کر دو۔ مجھے ایک جلسہ میں جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔“

دان۔ ”تو گولی ہی کیوں نہ مار دو کہ ہمیشہ کا چھنجھٹ مٹ جائے۔“

امرت۔ ”بس اب چیل چڑھنے کرو ورنہ یاد رکھو، پھر تمہاری صورت نہ دیکھوں گا۔ یہ دھمکی اپنا کام کر گئی۔ دان ناتھ نے خط پر دستخط کر دیے اور تب گز کر بولے۔ ”دیکھ لینا، میں آج سنکھیا کھا لیتا ہوں کہ نہیں، یہ خط دھرا ہی رہ جائے گا۔ سویرے ”رام نام سنت“ ہو گا۔“

امرت رائے نے خط ایک لفافے میں بند کر کے بوڑھے کو دیا۔ بدری پرشاد کا نام سنتے ہی بوڑھا مسکرا یا اور خط لے کر

چلا گیا۔

تب امرت رائے نے ہنس کر کہا۔ ”سونکھیا نہ ہوتو میں دیدوں گا۔ ایک بار کسی دوا میں ڈالنے کے لیے منگوائی تھی۔“  
دان ناتھ نے گبڑ کر کہا۔ ”میں تمہارا سر توڑ دوں گا، تم ہمیشہ سے مجھ پر حکومت کرتے آئے ہو اور اب بھی کرنا چاہتے ہو لیکن اب مجھ پر تمہارا کوئی داؤں نہ چلے گا۔ آخر میں بھی تو کوئی چیز ہوں۔“  
امرت رائے اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔

(7)

لالہ بدری پر شاد کو دان ناتھ کا خط کیا ملا۔ صدمے کے ساتھ ہی ذلت بھی ملی۔ وہ امرت رائے کی تحریر پہچانتے تھے۔ اس کی ساری عاجزی اور انجما اس تحریر میں گم ہو گئی۔ غصہ سے ان کا دماغ گرم ہو گیا۔ دان ناتھ کے کیا ہاتھ ٹوٹ گئے تھے، جو اس نے امرت رائے سے یہ خط لکھایا؟ کیا اس کے پیروں میں مہندی لگی تھی جو یہاں تک نہ آ سکتا تھا اور یہ امرت رائے بھی کتنا بے حیا ہے! وہ ایسا خط کس طرح لکھ سکا۔ ذرا بھی شرم نہ آئی۔

اب تک لالہ بدری پر شاد کو کچھ کچھ امید تھی کہ شاید امرت رائے کا جوش میں کیا ہوا عہد کچھ مدد ہم پڑ جائے۔ تحریر دیکھ کر پہلے وہ یہی سمجھے تھے کہ امرت رائے نے معافی مانگی ہو گئی لیکن خط پڑھا تو امید کا وہ باریک رشتہ بھی منقطع ہو گیا۔ دان ناتھ کا خط پا کر شاید وہ امرت رائے کو بلا کر دکھاتے اور ان کے جذباتِ حسد کو مشتعل کر کے اپنے پنج میں لانے کی کوشش کرتے۔ اس امید کی بھی دھجیاں اڑ گئیں۔ اس نے جلد پنک چڑک دیا۔ امرت رائے کی تحریر دیکھ کر غصے سے کامپتے ہوئے ہاتھوں سے انھوں نے دان ناتھ کو یہ خط لکھا۔

”لالہ دان ناتھ جی! آپ نے امرت رائے سے یہ خط لکھا کر میری اور پریما کی جتنی توبین کی ہے، اس کا آپ مطلق اندازہ نہیں کر سکتے۔ مناسب توبی تھا کہ میں اسے چھڑ کر پھینک دیتا اور آپ کوئی جواب نہ دیتا لیکن.....“

میں تک لکھنے پائے تھے کہ دیوبی نے آکر بڑے شوق سے پوچھا۔ ”کیا لکھا ہے امرت رائے نے؟“

بدری پر شاد نے کانڈ کی طرف سر جھکائے ہوئے کہا۔ ”ان کا کوئی خط نہیں آیا۔“

دیوبی۔ ”چلو کوئی خط کیوں نہیں آیا۔ میں نے کوئی پر دیکھا، ان کا آدمی ایک خط لیے پکا آ رہا تھا۔“

بدری۔ ”ہاں آدمی تو ان ہی کا تھا مگر خط تھا دان ناتھ کا! اُسی کا جواب لکھ رہا ہوں۔ حضرت نے امرت رائے سے لکھوا یا

ہے اور یچے اپنے دستخط کر دیے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے لکھتے شرم آتی تھی۔ بے ہودہ، شہدہ۔“

دیوکی - ”خط میں تھا کیا؟“

بدری - ”یہ پڑا ہے۔ پڑھ کیوں نہیں لیتیں۔“

دیوکی نے خط پڑھ کر کہا۔ ”تو اس میں اتنا بگڑنے کی کون سی بات ہے؟ ذرا دیکھوں سر کار نے اس کا کیا جواب لکھا ہے؟“

بدری - لودیکھو، ابھی تو شروع کیا ہے۔ ایسی خبر لوں گا کہ بچہ سارا شہدہ پن بھول جائے گا۔

دیوکی نے بدری پر شادا کا خط پڑھا اور پھاڑ کر بچینک دیا۔

بدری پر شادا نے کڑک کر پوچھا ”پھاڑ کیوں ڈالا؟ تم کون ہوتی ہو میرا خط پھاڑنے والی؟“

دیوکی - تم کون ہوتے ہو ایسا خط لکھنے والے؟ امرت رائے کو ہو کر کیا ابھی بھرنیں پایا۔ جواب دانو کو بھی کھو دینے کی فکر

کرنے لگے۔ تمہارے خط کا نتیجہ یہی ہو گا کہ دانو پھر تمہیں اپنی صورت کبھی نہ دکھائے گا۔ زندگی تو میری لڑکی کی خراب ہو گی، تمہارا کیا بگڑے گا؟

بدری - ”ہاں اور کیا۔ لڑکی تو تمہاری ہے، میری تو کوئی ہوئی نہیں۔“

دیوکی - ”آپ کی کوئی ہوتی تو اسے کنویں میں ڈھکلیے کو یوں تیار نہ ہو جاتے۔ یہاں دوسرا کون لڑکا ہے پر یہا کے لائق،

ذراسنلوں۔“

بدری - ”دنیا لائق لڑکوں سے خالی نہیں ہے، ایک سے ایک بڑھ کر پڑے ہوئے ہیں۔“

دیوکی - ”پاس کے دو تین شہروں میں تو کوئی دھالی نہیں دیتا۔ ہاں باہر کی میں نہیں کہتی، ستو باندھ کر کھو جنے لکھو گے تو معلوم

ہو گا۔ برسوں دوڑتے گزر جائیں گے، پھر بھی بے جانے پہچانے گھر میں لڑکی کوں بیا ہے گا اور پر یہا کیوں ماننے لگی۔“

بدری - ”اس نے اپنے ہاتھ سے کیوں خط نہیں لکھا۔ میرا تو یہ کہنا ہے کہ کیا اسے اتنا بھی نہیں معلوم کہ اس سے میری کتنی

تو ہیں ہوئی۔ سارے امتحانات تو پاس کیے بیٹھا ہے، ڈاکٹر بھی ہونے جا رہا ہے۔ کیا اسے اتنا بھی نہیں معلوم۔ صاف بات ہے کہ دونوں مل کر میری توہین کرنا چاہتے ہیں۔“

دیوکی - ”ہاں شہدے تو ہیں ہی، تمہاری توہین کرنے کے سوا اور ان کا کام ہی کیا ہے؟ صاف بات تو ہے اور تمہاری سمجھ

میں نہیں آتی۔ نہ جانے عقل تقسیم ہوتے وقت تم کہاں چلے گئے تھے؟ پچاس کے ہوئے اور اتنی موٹی سی بات نہیں سمجھ سکتے۔“

بدری پر شادا نے نہ کر کہا۔ ”میں تمہیں کھو جنے گیا تھا۔“

دیوکی اور ہیڑ ہونے پر بھی خوش مذاق تھی، بولی ”واہ میں پہلے ہی پہنچ کر کئی حصے اڑا لے گئی۔ دونوں میں کتنی دوستی ہے، یہ تو جانتے ہی ہو۔ داں ناتھ لحاظ سے خود نہ لکھ سکا ہوگا۔ امرت بابو نے سوچا ہوگا، کہ لالہ جی کوئی اور لڑکا نہ ٹھیک کرنے لگیں۔ اس لیے یہ خط دانو سے جبراً دستخط کرا لیے ہوں گے۔“

بدری پرشاد نے نہت سے کہا۔ ”انتا تو میں بھی سمجھتا ہوں، کیا ایسا گنوار ہوں۔“

دیوکی۔ ”تب کس لیے اتنا جامہ سے باہر ہو رہے تھے؟ بلا کر کہہ دو منظور ہے۔ بیچاری بورڈی ماں کے بھاگ کھل جائیں گے۔ مجھے تو اس پر ترس آتا ہے۔“

بدری۔ ”مجھے اب یہ افسوس ہو رہا ہے کہ پہلے ہی دانو سے کیوں نہ بیاہ کر دیا، اتنے دنوں تک کیوں امرت رائے کامنہ تاکتا رہا، آخر وہی کرنا پڑا۔“

دیوکی۔ ”لقدیر کو کون جانتا تھا اور حق تو یہ ہے کہ دانو نے پریما کے لیے تپیا بھی بہت کی۔ چاہتا تو اب تک کبھی کی اس کی شادی ہو گئی ہوتی۔ کہاں سے پیغام نہیں آئے۔ رشتہ داروں نے کتنا سمجھایا مگر اس نے کبھی ہاں نہ کی۔ پریما اس کے دل میں بھی ہوئی ہے۔“

بدری۔ ”لیکن پریما اسے قبول کرے گی۔ پہلے یہ تجویز کرلو۔ ایسا نہ ہو کہ میں یہاں منظور کرلوں اور پریما انکار کر دے۔ اس بارے میں اس کی منظوری لے لینی چاہیے۔“

دیوکی۔ ”پھر تم مجھے چڑھانے لگے۔ دانو میں کون سی برائی ہے جو وہ انکار کرے گی۔ لاکھوں میں ایک لڑکا ہے، ہاں یہ ضد ہو کہ کروں گی تو امرت رائے سے کروں گی ورنہ بے بیاہی رہوں گی، تو جنم بھران کے نام پر بیٹھی رہے۔ امرت رائے تو اب کسی بدھواہی سے بیاہ کرے گا۔ ممکن ہے بیاہ ہی نہ کرے، اس کا دید ہی دوسرا ہے۔ میری بات مانو۔ دانو کو خط لکھ دو۔ پریما سے پوچھنے جانچنے کا کام نہیں۔ دل ایسی چیز نہیں جو قابو میں نہ آ جائے۔ میرا دل تو اپنے پڑوں کے وکیل صاحب سے کرنے کا تھا۔ انھیں کوٹ پتلوں پہنے بکھری پر کچھری جاتے دیکھ کر میں خوش ہو جاتی تھی۔ مگر تمہارے نصیب جا گے، ماں باپ نے تمہارے پلے باندھ دیا۔ تو میں نے کیا کیا۔ دو ایک دن تو ضرور رخ ہوا مگر پھر ان کی طرف خیال بھی نہ گیا۔ تم شکل و صورت، عقل و تمیز، دولت و ثروت، کسی بات میں ان کی برابری نہ کر سکتے تھے مگر قسم لو جو میں نے شادی کے بعد کبھی بھولے سے ان کی یاد کی ہو۔“

بدری۔ ”اچھا جبھی تم بار بار مائیکے جایا کرتی تھیں!“

دیوکی۔ ”مجھے چھپیڑ دے گے تو میں کچھ کہہ بیٹھوں گی۔“

بدری۔ ”تم نے اپنی بات کہہ ڈالی تو میں بھی کہہ دیتا ہوں۔ میری بھی ایک عیسائی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ میں عیسائی ہونے والا تھا۔ رنگ روپ میں پری تھی۔ تم اس کے پیروں کی خاک کو بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ مجھے اب تک اس کی یادِ ستانی ہے۔“

دیوکی۔ ”جھوٹے کہیں کے! جب میں آئی تو مہینہ بھرتک تو تم مجھ سے بولتے شرماتے تھے۔ عیسائی عورت سے محبت کرتے تھے! وہ تو تمہیں بازار میں بیچ آتی! اور پھر تم لوگوں کی بات میں نہیں چلاتی، حق بھی ہو سکتی ہے۔“

بدری۔ ”ذر اپریما کو بلا لو پوچھ لینا ہی اچھا ہے۔“

دیوکی۔ (جھنجھلا کر) اس سے کیا پوچھو گے، اور وہ کیا کہے گی۔ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھ سے جب اس بارے میں باتیں ہوتی ہیں وہ یہی کہتی رہی ہے کہ میں کنواری رہوں گی، وہی پھر کہے گی۔ مگر اتنا میں جانتی ہوں کہ جس کے ساتھ تم بات چیت پکی کرو گے اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اتنا وہ جانتی ہے کہ گرہست لڑکی کنواری نہیں رہ سکتی۔“

بدری۔ ”رورو کرجان تو نہ دے گی؟“

دیوکی۔ ”نہیں میں ایسا نہیں سمجھتی! فرض کا اسے بڑا خیال رہتا ہے اور یوں تو پھر دکھتی ہے جسے دل میں اپنا سوامی سمجھ چکی تھی، اسے دل سے نکال کر پچھینک دینا کوئی سہل کام ہے؟ یہ زخم کہیں برسوں میں بھرے گا۔ اس سال وہ بیاہ کرنے پر راضی نہ ہو گی۔“

بدری۔ ”اچھا میں بھی آیا۔ پورنا سے پوچھوں۔ ان پڑھی لکھی لڑکیوں کا مزاج کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔ اگر فرض اور محبت میں مخالفت ہو گئی تو ان کی ساری زندگی ہی رنج میں گزرتی ہے وہ محبت اور فرض پر ایثار کرنا نہیں جانتیں یا نہیں چاہتیں۔ ہاں محبت اور فرض میں میل ہو جائے تو ان کی زندگی اعلیٰ زندگی ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی مزاج پریما کا معلوم ہوتا ہے۔ میں دنوں کو لکھے دیتا ہوں کہ مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔ مگر پریما سے پوچھ کر ہی تصفیہ کر سکوں گا۔“

دفعتاً کملہ پرشاد آ کر بولے۔ ”آپ نے کچھ سنائے ہے؟ بالو امرت رائے تو ایک بدھوا آشرم کھونے جا رہے ہیں۔ کمانے کا یہ

ڈھنگ نکالا ہے۔“

بدری پرشاد نے ذرا چیل بہ جبیں ہو کر پوچھا۔ ”کمانے کا یہ ڈھنگ کیا؟ میں نہیں سمجھتا۔“

کملہ۔ ”وہی جو اور لیڈر کرتے ہیں۔ آشرم میں بیواؤں کی پروش و پرواخت کی جائے گی، انھیں تعلیم بھی دی جائے گی۔ چندے کی رقمیں آئیں گی اور یا رلوگ مزے کریں گے۔ کون جانتا ہے، کہاں سے لکنے روپے آئے، پھر مہینے بھر میں ایک جھوٹا سچا حساب چھپا دیا۔ سنا ہے کئی روپا نے بڑے بڑے چندے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ پانچ لاکھ کا تخمینہ ہے۔ اس میں کم از کم پچاس ہزار تو یاروں کے ہیں! وکالت میں اتنے روپے اتنی جلدی کہاں ملے جاتے تھے؟“

بدری - ”پچاس ہزار ہی بنائے تو کیا بنائے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک لاکھ سے کم پر ہاتھ صاف نہ کریں گے۔“

کملہ - ”ان لوگوں کو سوچتی خوب ہے، ایسی باتیں ہم لوگوں کو نہیں سوچتیں۔“

بدری - ”جا کر دنوں ان کی شاگردی کرو۔ اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔“

کملہ - ”تو کیا میں کچھ کہتا ہوں۔“

بدری - ”ذرا بھی نہیں، تم کبھی جھوٹ بولے ہی نہیں۔ بھلا آج کیوں جھوٹ بولنے لگے۔ سچائی کے اوتار تھیں تو ہو۔“

دیوکی - ”چیز کہا ہے کہ ہون کرتے ہاتھ جلتے ہیں۔ وہ بے چارا تو اپکار کے لیے اپنا سب کچھ ہون کیے میختا ہے اور تمہاری نگاہوں میں اس نے دنیا والوں کو ٹھلنے کے لیے ایک سوانگ رچا ہے! آپ تو کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسروں کے بھلے کاموں میں رکاوٹ ڈالنے کو تیار! انھیں ایشور نے کیا نہیں دیا ہے جو یہ ڈھونگ رچتے؟“

کملہ - ”اچھا میں ہی جھوٹا سہی۔ اس میں جھٹڑا کا ہے کا؟ تھوڑے دنوں میں آپ ہی قاعی کھل جائے گی۔ آپ جیسے سیدھے سادے لوگ دنیا میں نہ ہوتے تو ایسے مکاروں کی تھیلیاں کون بھرتا؟“

دیوکی - ”بس چپ بھی رہو۔ ایسی باتیں تھیں منہ سے نکالنے شرم نہیں آتی۔ کہیں پریما کے سامنے ایسی بے سرپرکی باتیں نہ کرنے لگنا۔ یاد ہے کہ تم نے ایک بار امرت رائے کو جھوٹا کہا تھا تو اس نے تین دن تک لکھا نہیں کھایا تھا۔“

کملہ - ”یہاں ان باتوں سے نہیں ڈرتے، خوشامد کی باتیں کرنا مجھے نہیں آتا۔ کہوں گا چیز ہی، چاہے کسی کو بھلا لگے یا بر۔ وہ ہماری تو ہیں کرتے ہیں تو ہم ان کی پوجانہ کریں گے۔ آخر وہ ہمارے کون ہوتے ہیں جو ہم ان کے کرتوں پر پرده ڈالیں؟ میں انھیں اتنا بدنام کروں گا کہ سارے شہر میں کسی کو منہ نہ دکھائیں گے۔“

یہ کہتا ہو اکملہ چلا گیا۔ اسی وقت پریما نے کمرے میں قدم رکھا۔ اس کی پلکیں نم تھیں۔ گویا بھی روئی ہو۔ اس کا نازک جسم ایسا لاغر ہو گیا تھا گویا کسی نغمہ کی آواز بازگشت ہو۔ چہرہ کسی ہجران نصیب کی یاد ماضی کی طرح نحیف اور اداس تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”دادا جی،“ آپ ذرا بایودان ناتھ کو بلا کر سمجھا دیں کہ وہ کیوں جیجا پر جھوٹا الزم اگاتے پھرتے ہیں۔“

بدری پرشاد نے متین ہو کر کہا۔ ”دان ناتھ! وہ بھلا کیوں امرت رائے پر حملہ کرنے لگے۔ ان میں جیسی دوستی ہے ویسی تو میں نے اور کہیں دیکھی ہی نہیں۔“ پریما۔ ”یقین تو مجھے بھی نہیں آتا مگر بھیا جی بھی کہہ رہے ہیں۔ بدھوا آشرم کھونے کا جیجا جی کا بہت دنوں سے ارادہ تھا۔ کئی بار مجھ سے اس کے متعلق گفتگو ہو چکی ہے لیکن بایودان ناتھ اب یہ کہتے پھرتے ہیں کہ وہ اس چندہ سے روپیہ جمع کر کے زمینداری خریدنا چاہتے ہیں۔“

بدری - "کملًا کہتے تھے؟"

پریما - "ہاں بھیا جی کہتے تھے۔ دن ناتھ نے ان سے کہا ہو تو تعجب ہی کیا ہے۔"

بدری - "کملًا جھوٹ بول رہا ہے، سراسر جھوٹ، دانو کو میں خوب جانتا ہوں اس کا سا شریف آدمی میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ آج امرت رائے کے نفع کے لیے جان دینے کا موقع آجائے تو دانو شوق سے اپنی جان قربان کر دے گا۔ آدمی کیا ہیرا ہے۔ مجھ سے جب ملتا ہے بڑی عاجزی سے بیچھو لیتا ہے۔"

دیوکی - "کتنا بہس مکھ ہے، میں نے اسے جب دیکھا ہنتے ہی دیکھا۔ بالکل بچوں کا مزاج ہے۔ اس کی ماں روپا کرتی ہے کہ میں مرجاوں گی تو دانو کو کون کھلا پلا کر سلاۓ گا؟ دن بھر بھوکا بیٹھا رہے گا۔ مگر کھانا نہ مانگے گا اور اگر کوئی بلا بلا کر کھلانے تو تمام دن کھاتا ہی رہے گا۔ بڑی سادہ طبیعت کا ہے۔ غرور تو چھوکھی نہیں گیا۔"

بدری - "اب کے ڈاکٹر ہو جائے گا۔"

لالہ بدری پر شاداں آدمیوں میں تھے جو دُبھے میں نہیں رہنا چاہتے۔ کسی نہ کسی فیصلہ پر پہنچ جانا ان کے دلی اطمینان کے لیے ضروری تھا۔ دن ناتھ کے خط کا تذکرہ کرنے کا ایسا نادر موقعہ پا کر وہ ضبط نہ کر سکے۔ بولے۔ "یہ دیکھو! پریما: دانو نے ابھی ابھی یہ خط سمجھا ہے۔ میں تم سے مشورہ کرنے جاہی رہا تھا کہ تم خود ہی یہاں آگئیں۔"

خط کا مطلب کیا ہے، پریما اسے فوراً تارڑ گئی۔ اس کا دل زور سے دھڑ کنے لگا۔ اس نے کامنے ہوئے ہاتھوں سے خط لے لیا۔ مگر تحریر دیکھی تو صاف امرت رائے کی ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

تحریر دیکھ کر ایک دن اس کا دل کتنا خوش ہو جاتا تھا۔ آج وہی تحریر اس کی آنکھوں میں کاتا بن کر چھینے لگی۔ ایک ایک لفظ پچھوکی طرح اس کے دل پر ڈنک مارنے لگا۔ اس نے خط لے کر دیکھا۔ وہی تحریر تھی۔ وہی اس کی جانی بوجھی خوشمنا صاف تحریر، جو دلی اطمینان کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کا مطلب وہی تھا جو پریما نے سمجھا تھا۔ وہ اس کے لیے پہلے ہی سے تیار تھی۔ اسے یقین تھا کہ دن ناتھ اس موقع پر نہ چکیں گے۔ اس نے خط کا جواب پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا، شکریہ کے ساتھ، صاف انکار مگر یہ امرت رائے کے قلم سے نکلے گا، جس کا امکان ہی اس کے وہم و مگان سے باہر تھا۔ امرت رائے اتنے بے درد ہیں، اس کا اسے خیال بھی نہ ہو سکتا تھا۔ وہی دل جو امرت رائے کے ساتھ مصیبت کے سخت ترین صدائے اور آفتوں کی ناقابل برداشت تکلیفیں سہنے کو تیار تھا، آج اس بے اعتنائی کی تھیں نہ سہہ سکا۔ وہ بے مثال محبت، وہ غیر محدود عقیدت جو پریما نے ان میں برسوں سے مرکوز کر کھی تھی، ایک آؤرد کے ساتھ جاتی رہی۔ اسے معلوم ہوا گویا اس کے سارے اعضا سست پڑ گئے ہیں۔ گویا دل بھی ساکت ہو گیا ہے۔ گویا اس کی اپنی

زبان پر بھی بالکل قابو نہیں ہے۔ اس کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ لکل پڑے۔ ”آپ کی جو مرضی ہو سکیجے، مجھے سب منظور ہے۔“ وہ کہنے جا رہی تھی، جب کونئیں میں گرفناہی ہے تو جیسے کچاویسے پکا، اس میں کوئی فرق نہیں، مگر جیسے اس کو کسی نے خبردار کر دیا۔ وہ فوراً خط کو دیں پھینک کر اپنے کمرہ میں لوٹ آئی اور دریچے کے سامنے کھڑی ہو کر زار و قطار رو نے لگی۔

شام ہو گئی تھی، آسمان میں ایک ایک کر کے تارے نکلتے آتے تھے۔ پریما کے دل میں اسی طرح ایک ایک کر کے یادداشتیں آنے لگیں۔ دیکھتے دیکھتے سارا آسمان تاروں سے جگلگا اٹھا۔ پریما کا دل بھی یادداشتیں سے بندھ گیا۔ مگر ان بے شمار تاروں سے آسمان کی تاریکی کیا اور بھی گہری نہیں ہو گئی تھی۔

بیساکھ میں پریما کی شادی دان ناتھ کے ساتھ ہو گئی۔ بڑی دھوم دھام رہی۔ گل شہر کے رو سا کو مددو کیا گیا۔ لالہ بدربی پر شاد نے دونوں ہاتھوں سے دولت لائی۔ مگر دان ناتھ کی طرف سے کوئی تیاری نہ تھی۔ امرت رائے چندہ کی فراہمی کے لیے بہار کی طرف چلے گئے تھے اور تاکید کر گئے تھے، ”دھوم دھام مت کرنا۔“ دان ناتھ ان کی مرضی کے خلاف کیسے چلتے۔

ادھر پورنا کے آنے سے سومترا کو گوا آنکھیں مل گئیں۔ اس کے ساتھ ہاتین کرنے سے سومترا کو سیری نہ ہوتی۔ آدمی رات تک اپنا دکھ اسنایا کرتی۔ زندگی میں اس کا کوئی ساتھی نہ تھا۔ شوہر کی بے رخی روز ہی اس کے دل میں چھا کرتی تھی، اس بے رخی کا سبب کیا ہے، یہ مسئلہ اس سے حل نہ ہوتا تھا۔ وہ بہت خوبصورت نہ تھی، پھر بھی اسے کوئی بد صورت نہ کہہ سکتا تھا۔ بناؤ سنگھار کا تو اسے مرض سا ہو گیا تھا۔ شوہر کے دل بھانے کے لیے وہ نیا سنگھار کرتی تھی اور مقصد براری نہ ہونے سے اس کے دل میں آگ سی جلتی تھی! بھی کے چھینٹوں سے ہمڑ کنا تو آگ کے لیے قدرتی تھا۔ وہ پانی کے چھینٹوں سے بھی بھڑکتی تھی! کملہ پر شاد جب اسے اپنی محبت جاتے تو اس کے دل میں آتا کہ سینے میں چھری مارلوں۔ زخموں میں یونہی کیا کم درد ہوتا ہے کہ کوئی اس پر نمک چھڑ کے؟ آج سے تین برس پہلے سومترا نے کملہ کو پا کر اپنے کو دھنیہ مانا تھا۔ دو تین مہینے اس کے سکھ سے کٹے، مگر جوں جوں ہر دو طبائع کا تضاد آشکارا ہونے لگا، دونوں ایک دوسرے سے کھینچنے لگے۔ سومترافیاض تھی، کملہ اعلیٰ درجہ کا ممسک! وہ بیسہ کو ٹھیکری سمجھتی تھی، کملہ کوڑیوں کو دانت سے کپڑتا تھا۔ سومتراعموًا فقیروں کو بھیک دینے جاتی تو اتنا دبی کہ وہ ”چنکی“ کی انتہائی حد سے تجاوز کر جاتا تھا۔ اس کے مائیکے سے ایک مرتبہ بڑمنی کوئی خوش خبری لے آئی تھی، اسے اٹھا کر نئی ریشمی ساڑھی دے دی۔ ادھر کملہ کا یہ حال تھا کہ فقیر کی آواز سننے ہی گرج اٹھتے تھے۔ رول اٹھا کر مارنے دوڑتے تھے۔ دوچار کوپیٹ بھی دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ دروازہ پر جا کر کسی فقیر کی اگر کملہ پر شاد کی ٹڈ بھیڑ ہو گئی تو اسے دوسری مرتبہ وہاں جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ سومترا میں اعسار اور حرم تھا۔ کملہ میں گھمنڈ، چھپھورا پن اور خود غرضی۔ ایک آسمان پر کا جاندار تھا اور دوسرا زمین پر رینگنے والا، ان میں میل کیسے ہو؟

دان ناتھنے آ کر کہا۔ ”کملاء!“

پورنا کی آمد سے کملاء اور سومتراء ایک دوسرے سے اور بھی علاحدہ ہو گئے۔ سومتراء کے دل کا بوجھ ہاکا سا ہو گیا۔ یہاں تو وہ دن کا دن بے پرواںی سے پنگ پر پڑے رہنے میں گزار دیتی، کہاں اب وہ ہر وقت ہنسنی بولتی رہتی، کملاء کی اس نے پرواہی کرنا چھوڑ دی۔ وہ کب گھر میں آتا ہے اور کب جاتا ہے۔ کب کھاتا ہے اور سوتا ہے۔ ان باتوں کی اسے ذرا بھی فکر نہ رہی۔ کملاء پرشاد بدقاش نہ تھا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ اس میں خواہ کتنے ہی عیوب ہوں مگر عیاشی کا عیوب نہ تھا۔ کسی عورت پر تاک جھانک کرتے اسے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ پھر پورنا کے حسن نے اسے کس طرح گرویدہ کر لیا، یہ راز کون سمجھ سکتا ہے؟ شاید پورنا کی سادگی، عاجزی اور بے کسی نے کملاء کی نفسیاتی خواہشوں کو متحرک کر دیا۔ اس کی کنجوی اور بزدلی ہی اس کے اخلاق کی بنیاد تھی۔ عیاشی گران چڑھے۔ جیب کے روپے خرچ کر کے بھی کسی آفت میں بیٹلا ہو جانے کا جہاں ہر لمحہ امکان ہو، ایسے کام میں کملاء پرشاد جیسا ہوشیار آدمی نہ پڑسکتا تھا۔ پورنا کے بارے میں اسے کوئی تردد نہ تھا وہ اتنی سیدھی سادی تھی کہ اسے قابو میں لانے کے لیے کسی بڑی ریاضت کی ضرورت نہ تھی۔ اور پھر یہاں تو نہ کسی کا خوف تھا نہ بچنے کا اندر پیش اور نہ مار کھانے کا خیال۔ پورنا کی بے کسی نے ان تمام اندیشوں کو غیر مسلح بنادیا تھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ اب اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ صرف گھروالوں کی آنکھ بچالینا کافی ہو گا اور یہ بات کچھ مشکل نہ تھی مگر یہاں بھی ایک رکاوٹ پیدا ہو گئی اور وہ سومتراء تھی! سومتراء پورنا کو ایک لمحہ کے لیے بھی نہ چھوڑتی تھی۔ دونوں کھانا کھانے ساتھ جاتیں۔ چھت پر دیکھو تو ساتھ۔ کمرے میں دیکھو تو ساتھ، رات کو ساتھ، دن کو بھی دونوں ساتھ ہی ساتھ سو جاتیں۔ کملاء جب خواب گاہ میں جا کر سومتراء کا انتظار کرتا کرتا سو جاتا تو نہ جانے کب وہ اس کے پاس آ جاتی۔ پورنا سے تھائی میں کوئی بات کرنے کا اسے موقع نہ ملتا تھا۔ وہ دل میں سومتراء پر چھنچلا کر رہ جاتا۔ آخر ایک روز اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ رات کو جب سومتراء آئی تو اس نے کہا:

”تم رات دن پورنا کے پاس کیوں بیٹھی رہتی ہو؟ وہ اپنے دل میں سمجھتی ہو گی کہ یہ تو اچھی بلا گلے پڑی۔ ایسی تو بڑی سمجھدار بھی نہیں ہو کہ تمھاری باتوں میں اسے مزا آتا ہو، تمھاری بے وقوفی پر پشتی ہو گی۔“

سومتراء نے کہا۔ ”اکیلی پڑی پڑی کیا کروں؟ یہ بھی تو اچھا نہیں لگتا کہ میں آرام سے سوؤں اور وہ اکیلی رویا کرے، اٹھنا بھی چاہتی ہوں تو وہ لپٹ جاتی ہے۔ چھوڑتی ہی نہیں، دل میں میری بے وقوفی پر پشتی ہے یا نہیں، یہ کون جانے؟ مگر میرا ساتھ اسے اچھا نہ لگتا ہو، یہ بات نہیں۔“

کملاء۔ ”تمھیں یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ اس کی اور تمھاری کوئی برادری نہیں۔ وہ تمھاری سیلی بننے کے قابل نہیں ہے۔“

سومترا۔ ”میں ایسا نہیں سمجھتی۔“

کملہ۔ ”تمھیں اتنی سمجھتی نہیں۔ سمجھو گئی کیا؟“

سومترا۔ ”ایسی سمجھتی کا نہ ہونا ہی اچھا ہے۔“

اس روز سے سومتراسائے کی طرح پورنا کے ساتھ رہنے لگی۔

کملہ پرشاد کے طریقوں میں اب ایک عجیب تبدیلی سی ہوتی جاتی تھی۔ سینما دیکھنے کا اب اسے شوق نہ تھا۔ نوکروں پر ڈانٹ پھٹکار بھی کم ہو گئی۔ کچھ فراغ وست بھی ہو گیا۔ ایک روز بازار سے بگھے مٹھائی لایا۔ سومترا کو دیتے ہوئے کہا۔ ”ذرائعی سکھی کو چکھانا،“ سومترانے مٹھائی لے لی مگر پورنا سے اس کا ذکر نہ کیا۔ دوسرے روز کملانے پوچھا۔ ”پورنا نے مٹھائی پسند کی ہو گئی؟“ سومترا نے جواب دیا۔ بالکل نہیں۔ وہ کہتی تھیں کہ مجھے مٹھائی سے کبھی رغبت نہیں رہی۔“

کئی روز کے بعد ایک روز کملہ پرشاد دوریشی سائزیاں لائے اور بے دھڑک اپنے کمرے میں گھس گئے۔ دونوں سہیلیاں ایک ہی پلٹ پر لیٹیں با تین کر رہی تھیں۔ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پورنا کا سرکھلا ہوا تھا۔ شرم کے مارے اس کے جسم میں پیسہ آ گیا۔ سومترانے شوہر کی طرف غصہ بھری نگاہوں سے دیکھا۔

کملہ نے کہا۔ ”ارے پورنا بھی یہیں ہیں۔ معاف کرنا پورنا مجھے معلوم نہ تھا۔ یہ دیکھو سومترا، دوسرا یاں لایا ہوں۔ سستے داموں میں مل گئیں۔ ایک تم لے لو اور ایک پورنا کو دے دو۔“

سومترانے سائزیوں کو بے چوئے ہی کہا، ان کی تو آج کوئی ضرورت نہ تھی۔ میرے پاس سائزیوں کی کوئی کمی نہیں ہے اور پورنا ریشی سائزیاں پہننا چاہیں گی تو میں اپنی نئی سائزیوں میں سے ایک دے دوں گی۔ ”کیوں بہن! ان میں سے لوگی کوئی سائزی؟“ پورنا نے سر ہلا کر کہا۔ ”نہیں، ریشی لے کر کیا کروں گی؟“

کملہ۔ ”کیوں ریشی سائزی تو کوئی چھوٹ کی چیز نہیں۔“

سومترا۔ ”چھوٹ کی چیز نہیں مگر شوق کی چیز تو ہے۔ سب سے پہلے تو تمہاری والدہ ماجدہ ہی چھاتی پیٹنگ لگیں گی۔“

کملہ۔ ”مگر اب تو میں لوٹانے نہ جاؤں گا۔ براز سمجھے گا دام سن کر ڈر گئے۔“

سومترا۔ ”بہت اچھی ہوں تو پریما کے پاس بیٹھ جوں۔ تمہاری خریدی ہوئی سائزی پا کر اپنا بھاگ سراہیں گی۔ معلوم ہوتا

ہے کہ آج کل کہیں کوئی رقم مفت ہاتھ آگئی ہے۔ سچ کہنا کس کی گردان ریتی ہے؟ گانٹھ کے روپے خرچ کر کے تم ایسی بے کار چیز کبھی نہ لیتے ہو گے۔“ کملہ نے غصب آلو دنگا ہوں سے سومتراء کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”تمہارے باپ کی تجویزی توڑی ہے اور بھلا کہاں

ڈاکہ ڈالنے جاتا؟“

سومترا - ”ماں نے تو وہ یوں بھی دے دیتے۔ تجویری توڑنے کی نوبت نہ آتی۔ مگر عادت کو کیا کرو۔“

کملانے پورنا کی طرف منہ کر کے کہا۔ ”سنی ہو پورنا، ان کی باتیں! شوہر سے باتیں کرنے کا یہی طریقہ ہے؟ تم بھی انھیں نہیں سمجھاتیں۔ اور کچھ نہ سہی تو آدمی سیدھے منہ بات تو کرے۔ جب سے تم آئی ہوان کا دماغ اور بھی آسمان پر چڑھ گیا ہے۔“ پورنا کو سومترا کی تختی بری معلوم ہو رہی تھی۔ تنهائی میں کملا پرشاد سومترا کو جلاتے ہوں، مگر اس وقت سومترا ہی انھیں جلا رہی تھی۔ اسے اندر پہنچا کر کہیں کملابھ جس سے ناراض ہو گئے تو مجھے اس گھر سے نکلا پڑے گا۔ کملا کو ناراض کر کے بیہاں ایک دن بھی بناہ نہیں ہو سکتا، وہ یہ جانتی تھی اس لیے وہ سومترا کو سمجھاتی رہتی تھی، بولی۔ ”میں تو براہ سمجھایا کرتی ہوں۔ باپو جی پوچھ لیجیے۔ جھوٹ کہتی ہوں۔“ سومترا نے تیز لہجے میں کہا۔ ”ان کے آنے سے میرا دماغ کیوں آسمان پر چڑھ لگی، ذرا یہ بھی بتا دو، مجھے انھوں نے راج گذاری پر نہیں بٹھا دیا تھا۔ ہاں تب اکیل پڑی رہتی تھی۔ اب گھری دو گھری ان کے ساتھ بیٹھ لیتی ہوں۔ کیا تم سے اتنا بھی نہیں دیکھا جاتا؟“

کملा - ”تم فضول بات بڑھاتی ہو سومترا! میں یہ کہتا ہوں کہ تم ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ترک کر دو۔ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی۔“

سومترا - ”اور کہنے کا مطلب ہی کیا ہے کہ جب سے یہ آئی ہیں، تمہارا دماغ آسمان پر چڑھ گیا ہے؟“

کملा - ”کچھ جھوٹ کہہ رہا ہوں؟ پورنا خود کیوں رہی ہیں۔ تمھیں ان کی نیک صحبت سے کچھ اچھی باتیں سیکھنی چاہیے تھیں۔ بیہاں انھیں لا کر رکھنے میں میرا ایک مقصد یہ بھی تھا مگر تم پر ان کی صحبت کا الٹا ہی اثر ہوا۔ یہ بیچاری سمجھاتی ہوں گی مگر تم کیوں مانے گیں؟ جب تم مجھی کو کچھ نہیں کہتیں تو یہ بے چاری کس کنتی میں ہیں؟ بھگوان سب کچھ دے مگر بربے کا ساتھ نہ دے۔ تم ان میں سے ایک ساڑھی رکھ لو پورنا۔ دوسرا میں پریما کے پاس بھیجے دیتا ہوں۔“

سومترا نے دونوں ساڑیوں کو اٹھا کر دروازہ کی طرف پھینک دیا۔ دونوں کاغذ میں تہہ کی ہوئی رکھی تھیں۔ صحن میں جا کر گریں۔ مہری اس وقت صحن دھورہی تھی، جب تک وہ دوڑ کر ساڑیاں اٹھائے، کاغذ بھیگ گیا اور ساڑیوں میں داغ پڑ گئے۔ پورنا نے خاترات کے لجھے میں کہا۔ ”بہن دیکھو تو ساڑیاں خراب ہو گئیں۔“

کملा - ”ان کی کرو تو تیں دیکھتی جاؤ۔ اس پر میں ہی برا ہوں۔ مجھی میں دنیا بھر کے عیب ہیں۔“

سومترا - ”تو لے کیوں نہیں جاتے اپنی ساڑیاں؟“

کملا۔ ”میں تھیں تو نہیں دیتا۔“

سومترا۔ ”پورنا بھی نہ لیں گی۔“

کملا۔ ”تم ان کی طرف سے بولنے والی کون ہوتی ہو؟ تم نے اپنا ٹھیکہ لیا ہے یا زمانے بھر کا؟ بولو بورنا، ایک رکھ دوں نا؟

یہ سمجھ لو کہ تم نے انکار کر دیا تو مجھے بڑا رنگ ہو گا۔“

پورنا بڑے شش و پنج میں پڑ گئی، اگر ساڑی لیتی ہے تو سومترا کو برالگتا ہے، اگر نہیں لیتی تو کملا برامانتے ہیں۔ سومترا! کیوں

اتی ہٹ کر رہی ہے۔ کیوں اتنا جائے سے باہر ہو رہی ہے، یہ بھی اس سے پوشیدہ نہ رہا۔ دونوں پہلوؤں پر غور کر کے اب اس نے

سومترا ہی کو خوش رکھنے کا ارادہ کر لیا۔ کملا روٹھ کر اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، زیادہ سے زیادہ اسے یہاں سے چلا جانا پڑے گا۔

سومترا ناراض ہو گئی تو نہ جانے کیا غصب ڈھانے، نہ جانے اس کے دل میں کیسے کیسے برے خیالات پیدا ہوں، بولی: ”بابو جی! ریشمی

ساڑیاں پہننے کی مجھے منای ہے، تو لے کر کیا کروں گی؟ ایسا ہی ہے تو کوئی موٹی مہین دھوٹی لاد بیجے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے کملا پرشاد کی طرف معذور نگاہوں سے دیکھا۔ ان میں کتنی عاجزی، کتنی معذوری بھری ہوئی تھی گویا وہ کہہ

رہی تھیں کہ لینا تو چاہتی ہوں مگر لوں کیسے؟ انھیں آپ دیکھ رہے ہیں۔ کیا گھر سے نکلنے کی خواہش ہے؟

کملا پرشاد نے کوئی جواب نہ دیا۔ ساڑیاں چپکے سے اٹھا لیں اور پیر پکتے ہوئے باہر چلے گئے۔

(پریم چند)

## مشق

### سوالات

1. پریم چند کی ناول نگاری کی خصوصیات پر ایک تقدیم مضمون لکھیے۔

2. ناول ”بیوہ“ کے اہم کردار کوں سے ہیں اور پریم چند ان کی عکاسی میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟

3. ناول ”بیوہ“ کے ذریعے پریم چند ہمیں کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟ وضاحت کیجیے۔

## ڈراما

علمی ادب میں صفتِ ڈراما کو ہمیشہ سے بلند مقام حاصل رہا ہے۔ وہ ہندوستان ہو، یونان ہو یا برطانیہ، ہر جگہ اس صفت کی پذیری اور ترقی ہوئی ہے۔ ڈرامے کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ مگر اس کی ایک سادہ ہی تعریف یہ ہے کہ ”ڈراما کسی قصے یا واقعے کو اداکاروں کے ذریعے، ناظرین کے رو برو عمد़اً پیش کرنے کا نام ہے۔“ اس سے واضح ہوا کہ ڈراما ناول یا افسانے کی طرح صرف لکھے یا پڑھے جانے تک محدود نہیں۔ اس کے لیے پیش کش ضروری ہے بلکہ یہ مکمل ہی تب ہوتا ہے جب اسے عمد़اً اٹھ پر پیش کر دیا جائے۔ ناول اور افسانے کی طرح ڈرامے میں بھی پلاٹ، کردار، مکالمہ اور کوئی نہ کوئی مرکزی خیال ہوتا ہے۔ مگر قصے کی عملی پیش کش ہی اسے ناول اور افسانے سے ممیز کرتی ہے۔

بنیادی طور پر ڈرامے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ 1۔ ٹریجڈی (المیہ) 2۔ کامیڈی (طریقہ)۔ ان دونوں عناصر، یعنی الہم و طرب کے امتحان سے بھی ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ اس طرح المیہ طریقہ وجود میں آیا۔ اس کے علاوہ ”میلو ڈراما“، ”فارس“، ”ڈریم“، اور ”اوپیرا“ بھی ڈرامے کی اقسام میں شامل ہیں۔

اردو ڈرامے کی ابتداء 1844 سے 1855 کے دوران واجد علی شاہ کی ڈرامائی پیش کش اور امامت و مداری لال کی اندر سمجھاؤں سے لکھنؤ میں ہوئی۔ مگر اسے عروج حاصل ہوا پارسی اٹھ کے ڈراموں سے۔ جس زمانہ میں لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح میں اندر سمجھاؤں کی وہوم مچی ہوئی تھی، اسی زمانے میں ممبئی میں مغربی اثرات کے تحت ایک نئے نئے قسم کا ڈراما وجود میں آ رہا تھا جسے پارسی اٹھ کا نام دیا گیا۔ یہ نام اسے اس لیے دیا گیا کیونکہ اس کی ابتداء اور ترقی میں پارسیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

پارسی اٹھ کا پہلا ڈراما ”خورشید“ ہے جسے 1870 میں ایڈل جی گھوری نے لکھا تھا۔ اس سے پہلے بھی کچھ ڈرامے لکھے گئے مگر وہ مستیاب نہیں ہیں۔ پارسی اٹھ کے ڈرامے بھی ابتدائی اردو ڈراموں کی طرح منظوم ہوتے تھے۔ ان میں رقص، موسیقی اور گاؤں کا استعمال بھی ویسا ہی تھا۔ قصے اور کردار بھی فوق فطری ہوتے تھے مگر پیش کش کا انداز ابتدائی ڈراموں سے مختلف تھا۔ ”پروینیم“، یعنی آگے گرنے والے پردے کا استعمال پارسی اٹھ سے شروع ہوا۔ اب اٹھ کی کچھلی دیوار پر سین سینزیوں والے پردے لگائے جانے لگے۔ ہر ذیلی سین پر بھی پرده گرنے اور اٹھنے لگا۔ اٹھ پر طرح طرح کی مشینوں کا استعمال ہونے لگا۔ مکالموں میں دھیرے دھیرے نثر کا استعمال بڑھا۔ گانے کم ہو گئے۔ فوق فطری واقعات اور کرداروں کے بجائے روزمرہ زندگی کے واقعات اور مسائل ڈرامے کا موضوع بننے لگے۔

# آغا حشر کاشمیری

1931/1935 تا 1876/1879



آغا حشر اتر پردیش کے شہر بخارس میں پیدا ہوئے، اصل نام محمد شاہ تھا۔ آغا حشر نے عربی، فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ بعد میں انگریزی تعلیم کے لیے اسکول بھی بھیج گئے مگر پڑھنے لکھنے سے زیادہ ان کا دل سیر و تفریح اور شعرو شاعری کی محفوظ میں لگتا تھا۔ وہ بہت ذہین تھے۔ جو کچھ پڑھتے حرف بہ رف یاد ہو جاتا تھا۔

اس دور میں پارسی تھیٹر کی کمپنیاں شہر گھوم کر ڈرامے دکھایا کرتی تھیں۔ 1897 میں ”افریڈ جولی کمپنی“ بخارس پہنچی۔ اس کے اہم ڈراما نگار احسن لکھنی تھے۔ آغا حشر ڈرامے دکھانے جاتے تو احسن سے ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں۔ ایک روز کسی بات پر احسن سے الجھ گئے اور یہ کہہ کر چلے آئے کہ ایسے ڈرامے تو میں ایک ہفتے میں لکھ سکتا ہوں۔ لہذا اپنا پہلا ڈراما ”آفتاب مجبت“ لکھا جو 1897 میں بخارس کے ”جوہرا کسیر پرنس“ سے شائع ہوا۔ اس ڈرامے کی اشاعت سے ان کی بہت بہت افزائی ہوئی۔

ڈراما نگاری کے شوق میں آغا حشر بھی پہنچ گئے تو وہاں ان کا مقابلہ بڑے بڑے تجربہ کار ڈراما نگاروں سے تھا۔ چنانچہ انھوں نے ڈرامے لکھنے اور ادبی و علمی لیاقت بڑھانے کے لیے خوب مختت کی۔ انھیں ڈراما نگار کی حیثیت سے پہلی نوکری ”افریڈ تھیٹر یک کمپنی“ میں ہی ملی، جس کے لیے انھوں نے پہلا ڈراما ”مرید شک“ کھما۔ اس کی مقبولیت نے آغا حشر کو بہت جلد شہرت کی بلندیوں تک پہنچادیا اور یہ شہرت روز بروز بڑھتی گئی۔

فیکی کہانیوں کو شامل کر کے ان کے ڈراموں کی کل تعداد 38 ہے۔ ان کے ڈراموں میں تین طرح کے پلاٹ پائے جاتے ہیں۔ پہلے وہ جو مغربی ڈراموں سے مانگوڑ ہیں۔ دوسرے وہ جو تاریخی یا نیم تاریخی واقعات پر مبنی ہیں۔ تیسرا وہ جو سماجی اور اصلاحی موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔

”یہودی کی لڑکی“، آغا حشر نے 1913 میں لکھا۔ یہ ان کے سب سے زیادہ مقبول ڈراموں میں شامل ہے۔ آغا حشر نے اس میں بظاہر رومان سلطنت اور یہودی قوم کے درمیان کش کش دکھائی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہودی قوم اور رومان مذہبی پیشووا

کے پردے میں انگریزی حکومت اور ہندوستانی عوام کے درمیان جاری کش مشکل پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح براہ راست مفہوم کے ساتھ ساتھ اس ڈرامے کا ایک علمتی مفہوم بھی نکلتا ہے۔

اس ڈرامے میں کردار نگاری اوسط درجے کی ہے، کوئی ایسا کردار نہیں جو ہمارے دلوں پر نہ مٹنے والا نقش چھوڑ جائے۔ پھر بھی، وقت طور پر، اس کے کردار ہمیں متاثر ضرور کرتے ہیں۔ اس میں مکالمے چھوٹے اور برجستہ ہیں، جن میں گنتگو کا انداز پایا جاتا ہے۔ زبان سلیس اور رواں ہے۔ جو بات نثر میں کہی جاتی ہے، آغا حشر اس میں زور پیدا کرنے کے لیے اسے شعر میں بھی دہراتے ہیں۔ یہ طریقہ اس وقت پسندیدہ تھا مگر اب یہ تکرار گراں گزرتی ہے۔ اس ڈرامے میں متفرق اشعار کم ہیں۔ نثر کو پُر کشش بنانے کے لیے کہیں کہیں اس میں قافیے کا استعمال ہوا ہے۔ تشبیہ و استعارے کے استعمال سے بھی وہ اپنی نثر کو پُر اثر بناتے ہیں۔ پیش کش کے لحاظ سے بھی یہ ڈراما نہایت موزول ہے۔ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے اسٹچ پر پیش کرنے میں وقت ہو۔ اسٹچ کی ضروریات کو نظر میں رکھ کر ہی اسے لکھا گیا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ اردو کا ایک شاہکار ڈراما ہے، جو طویل بھی ہے اور جسے مکمل طور پر اس کتاب میں نہیں پیش کیا جاسکتا۔ چنانچہ اسے مختصر کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں اصل قصہ کے ساتھ ساتھ ایک مزاجیہ قصہ ”نصیبیں“ اور ”کرامت“ کا بھی چتر رہتا ہے، جس کا اصل قصہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لہذا اسے نکال دیا گیا ہے۔ غیر ضروری اشعار اور گانے بھی خارج کر دیے گئے ہیں۔ کچھ مکالمے بھی نکال دیے گئے ہیں۔ مگر یہ اس سلیقے کے ساتھ کیا گیا ہے کہ کہانی میں تسلسل برقرار رہے اور اصل قصہ کہیں مجروح نہ ہو۔

اس ڈرامے کا قصہ اس طرح ہے کہ سلطنت روم میں رومن کے علاوہ یہودی قوم بھی آباد ہے۔ ایک نوجوان مارگس کو عزرا یہودی کی لڑکی حتا سے محبت ہو جاتی ہے۔ حتا بھی اس سے سچی محبت کرتی ہے مگر مختلف وجوہات کی بنا پر، اسے شبہ ہو جاتا ہے کہ مارگس یہودی نہیں ہے۔ وہ مارگس سے زور دے کر حقیقت دریافت کرتی ہے تو وہ رومن ہونے کا اقرار کر لیتا ہے۔ مگر اس سے سچی محبت کا لیقین بھی دلاتا ہے اور گھر سے کہیں دور چل کر شادی کر لینے کے لیے کہتا ہے۔ پہلے تو حتا تیار نہیں ہوتی، مگر مارگس خود کشی کر لینے کی دھمکی دیتا ہے تو حتا کو اس کی محبت پر لیقین آ جاتا ہے۔ دونوں گھر سے جانا ہی چاہتے ہیں کہ عزرا سامنے آ جاتا ہے، جو چھپ کر ساری باتیں سن رہا تھا۔ دونوں اس سے معافی مانگتے ہیں اور حرم کی درخواست کرتے ہیں۔ عزرا شادی کے لیے تیار ہو جاتا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ مارگس یہودی مذہب اختیار کر لے۔ مارگس تیار نہیں ہوتا اور وہاں سے چلا جاتا ہے۔

ایک روز حتا اور مارگس کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ وہ عام آدمی نہیں بلکہ اس ملک کا ولی عہد ہے۔ اگر وہ اپنا

مذہب تبدیل کر لیتا تو اسے سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ وہیں حتا کو پتہ چلتا ہے کہ مارکس کی شادی کل شہزادی آکٹیویا سے ہونے جا رہی ہے، جو پہلے سے طے تھی۔ اسے بے حد رنج ہوتا ہے اور وہ اسے روکنے کا تہیہ کر لیتی ہے۔

شادی کے موقع پر عزرا یہودی اپنی قوم کی طرف سے نذر ان پیش کرنے کے لیے دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ حتا بھی وہاں پہنچ جاتی ہے اور بادشاہ کو ساری بات بتا کر انصاف کی طلب گار ہوتی ہے۔ بادشاہ شہزادہ مارکس سے پوچھتا ہے تو وہ اپنے جرم کا اقرار کر لیتا ہے۔ بادشاہ اسے قید کر کے مذہبی عدالت میں مقدمہ چلانے کا حکم دیتا ہے۔

اسی روز شہزادی، حتا کے پاس جاتی ہے اور شہزادے کو معاف کر دینے کی درخواست کرتی ہے۔ حتا کو مارکس پر حرم آجاتا ہے اور اپنا الزام واپس لے لیتی ہے مذہبی پیشوں بروٹس جو یہودیوں سے نفرت کرتا ہے اور پہلے بھی ان پر کافی ظلم کر چکا ہے، شہزادے پر جھوٹا الزام لگانے کے جرم میں حتا اور عزرا کو جلتے ہوئے تیل میں ڈال دیے جانے کا حکم دیتا ہے۔ مارکس ان کے لیے رحم کی درخواست کرتا ہے، تو بروٹس، عزرا کو مذہب تبدیل کرنے کی شرط پر معافی دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ عزرا اسے نہیں مانتا ہے اور اسے سولہ سال پہلے کا واقعہ یاد دلاتا ہے، جب شاہ ”نیرہ“ کے حکم سے شہر روما میں چاروں طرف آگ بھڑک رہی تھی۔ اس آگ میں بروٹس کی بیوی جل کر خاک ہو گئی تھی۔ مگر اس کی شیر خوار بیٹی کو آگ سے اسی نے چھالیا تھا۔ اور اب بیٹی اس کی بیٹی ہے، جسے اس نے اپنی بیٹی کی طرح پالا ہے۔ بروٹس ثبوت مانگتا ہے۔ عزرا یہودی حتا کے گلے میں پڑا ہوا شاہی خاندان کا تعویذ اور مردار یہ کی مالا دکھاتا ہے۔ بروٹس اسے بھیجاں کر تصدیق کرتا ہے۔ اپنے کیے پر شرم نہ ہوتا ہے۔ دونوں سے معافی مانگتا ہے اور آئندہ کے لیے نیک زندگی گزارنے کا عہد کرتا ہے۔

اس وقت آکٹیویا حتا سے کہتی ہے کہ تم بھی شاہی خاندان سے ہو، تو کیوں نہ میری ہر راحت اور خوشی میں برابر کی شریک ہو جاؤ۔ بادشاہ بھی اس کی اجازت دے دیتا ہے مگر حتا بیٹی کہتی ہے کہ مجھے اس جھوٹی دنیا کی کوئی چیز نہیں چاہیے۔ تم دونوں جیو اور خوش رہو۔ یہیں ڈراما ختم ہو جاتا ہے۔

# یہودی کی لڑکی

کردار

مرد

رومن شہزادہ	مارگس	.1
مذہبی رہنما	بروٹس	.2
ایک بوڑھا یہودی	عزراء	.3
رومن بادشاہ	بادشاہ	.4
رومن فوج کا سپاہی	سپاہی	.5
رومن سردار	کلیشیش	.6

خواتین

مارگس کی معشوقہ	حتّا	.1
رومن شہزادی اور مارگس کی مگنیت	آکٹیویا	.2
آکٹیویا کی ملازمہ	جونا	.3

# پہلا ایکٹ — پہلا سین

## محل

مارگس : آکٹیویا، تم اور بیہاں؟

آکٹیویا : ۔

جو نظر اب ہے وہ پہلے تری بے دید نہ تھی  
اس طرح آنکھ بدل لے گا یہ امید نہ تھی

آخر اس بے رخی کا سبب؟



مارکس : کوئی نہیں۔  
 آکٹیویا : اس ناراضگی کا باعث؟  
 مارکس : کچھ نہیں۔  
 آکٹیویا : تو پھر کیا ہو گیا؟  
 مارکس : سودا ہو گیا۔  
 آکٹیویا : ہوش و حواس کدھر گئے؟  
 مارکس : مر جم آرزوؤں کے ساتھ وہ بھی مر گے۔  
 آکٹیویا : تو کیا اب مجھ تم سے کوئی آس نہیں؟  
 مارکس : آس دلانے والی چیز ہی میرے پاس نہیں۔  
 آکٹیویا : میرے پیارے وہ کیا؟  
 مارکس : دل۔

میں دل کو روؤں گا اور روئے گا دل عمر بھر مجھ کو  
 نہ میری ہے خبر دل کو نہ دل کی ہے خبر مجھ کو

## پہلا ایکٹ — دوسرا سین

### یہودیوں کا محلہ

(مارکس کا یہودیوں کے لباس میں آنا)

مارکس : پیاری ٹھتا۔ میری یہ خواہش ہے کہ تم چھرے پر نقاب ڈالے بغیر گھر سے باہر نہ نکلا کرو۔  
 ٹھتا : اس کی وجہ؟  
 مارکس : وجہ یہ ہے کہ جس طرح بارش سے دھلے ہوئے شفاف آسمان پر شفت کی سرفی شہاب پاشی کرتی ہوئی حد نظر تک پھیل

جاتی ہے تو تمام دنیا بے پایاں مستی میں ڈوبی ہوئی پُر شوق نگاہوں سے اس کی دلفریوں پر قربان ہونے لگتی ہے اسی طرح جب تمھارے گلابی گالوں کے عکس سے کائنات کا ذرہ ذرہ جگانے اور ہنسنے لگتا ہے تو قدرت کی مخلوق ہی نہیں خود قدرت بھی تسمیں پیار سے دیکھنے لگتی ہے۔

ہے نظر کا تب کی اپنے ہاتھ کی تحریر پر  
خود مصور بھی مٹا جاتا ہے اس تصویر پر



حنا : تو میرے پیارے۔ تم رشک کرتے ہو؟

مارکس : رشک؟ میں اُس لباس پر رشک کرتا ہوں جو تمھارے خوبصورت جسم کو اپنی آنکھوں میں لیے رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں تمھارے سامنے سے رشک کرتا ہوں جو ان قدموں سے لپٹا ہوا ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

اسیر پچہ عہد شباب کر کے مجھے

کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے

کسی کے درد محبت نے عربہر کے لیے

خدا سے مانگ لیا منتخب کر کے مجھے

(دونوں کا گاتے ہوئے جانا۔ رومان سرداروں کا داخل ہونا)

سپاہی نمبر 1: تو کیا آپ اس مشرقی ستارہ کو روم کی کلیو پٹیرا کا خطاب دیتے ہیں؟

کیشیش : ہاں۔ اور اس خطاب پر بھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے حسن خداداد کی داد دینے میں بُخل سے کام لے رہا ہوں۔

سپاہی نمبر 2: جب تو اُس کے حسن کی غلامی کرنے کے لیے رومن سورماؤں میں سے بہت سے سینزروائیٹو نیو پیدا ہو جائیں گے۔

سردار : دیکھو دیکھو وہ کافر ادا یہودن اسی طرف آ رہی ہے۔

کیشیش : قسم ہے رومن خون کی۔ میں اس روم کی سب سے زیادہ حسین دو شیزہ کے حسن کی داد دیے بغیر کھی یہاں سے نہ جاؤں گا۔

سپاہی نمبر 1: اس کی مرضی کے خلاف؟

کیشیش : ہاں۔ ہاں۔

سپاہی نمبر 3: جرا؟

کیشیش : بے شک۔ ہم کون ہیں؟

سپاہی نمبر 2: معزز رومن۔

کیشیش : اور یہودی کون ہیں؟

سپاہی نمبر 4: رومنوں کے ادنیٰ غلام۔

کیشیش : تو بس پس و پیش بیکار ہے۔ غلام اور غلام کے مال پر آقا کو ہر طرح کا اختیار ہے۔

(حنا کا آتا)

حنا : (پھول سے مخاطب ہو کر) ۔

فدا ہوں جس طرح اُس گل پہ تجھ پر بھی فدا ہوتی

جو تجھ میں اُس کی رنگت، اس کی بو، اس کی ادا ہوتی

کیشیش : ۔

فقط یہ پھول ہی کیا مستحق ہے مہربانی کا

إدھر بھی اک اچھتی سی نظر، صدقۃ جوانی کا

حٹا : جناب آپ کون ہیں؟ اور کیا چاہتے ہیں؟

کیشیش : میں یہ پوچھتا ہوں کہ یہ پھول زیادہ نظر فریب ہے یا یہ یہ زیادہ خوبصورت ہے یا یہ؟ اس کی پنکھڑیوں کو دیکھ کر طبیعت لپھاتی ہے یا ان پنکھڑیوں کو؟

حٹا : صاحب آپ ہوش میں ہیں؟

کیشیش : ۔

رحم کرتی ہیں کہیں، یہ نگس مے نوش بھی

اک نظر میں دل بھی چھینا ساتھ دل کے ہوش بھی

حٹا : بس بس۔ ایک غیرت دار شریف زادی اس سے زیادہ اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتی۔

کیشیش : ۔

مست مے نشاط بھی ہیں باغ باغ بھی

آنکھیں بھی شاد کام ہوئیں اور دماغ بھی

منٹ پذیر حسن خدا داد کیجیے

یہ ہونٹ رہ گئے ہیں انھیں شاد کیجیے

(حٹا کو پکڑ لینا)

حٹا : چھوڑ دے۔ چھوڑ دے بے رحم موزی مجھے چھوڑ دے۔

کیشیش : ۔

صرف کر دے زور، جتنا بھی پرو بازو میں ہے

چھٹ چکا وہ صید جو صیاد کے قابو میں ہے

حٹا : دوڑو۔ بچاؤ۔ یہ کہیںہے میری عزت پر حملہ کرتا ہے۔

(مارکس کا یہودی کے لباس میں آنا)

مارکس : خبردار۔ او بدمعاش پا جی۔ اگر ایک انج بھی آگے بڑھا تو یہ بالشت بھر کی چھری قبستک سینے میں اتار دوں گا۔

کیشیش : تو کون؟

مارگس : تجھ پر لعنت بھیجنے والی زبان، تجھے سزا دینے والا ہاتھ۔

کیشیش : حقیر ہستی۔ کیا تو رومن قوم کے معزز نوجوان کا مقابلہ کرنے آیا ہے؟

مارگس : معزز؟ ایسی کمینی حکتیں اور معزز؟ جب تمہارا دل، تمہارا خیال، تمہاری ہرجیز ذلیل ہے تو پھر تمہارے معزز ہونے کی کیا دلیل ہے؟

کیشیش : بس خاموش۔ شاید تیرے دل میں اپنی زندگی کا پیار نہیں ہے۔ کیا تو رومن قوم کے غرور، غصہ اور بیبت ناک انتقام سے خود انہیں ہے؟

مارگس : ذلیل غلام۔ تو اپنے پا جیانہ خیالات کے اٹھاڑا میں تمام رومن قوم کو کیوں شامل کرتا ہے؟۔۔۔ یہ طرزِ زیست ہے ان کی نہ یہ قرینہ ہے

وہ سب کمینے نہیں صرف تو کمینہ ہے

کیشیش : بس یا اپنی بذریعی سے اپنی موت کے فتوے پر مہر کر چکا۔ سپاہیوں باندھ لواس باغی کو۔

مارگس : بدبخت، نامراد۔ بھالے نیچے جھکا دو۔

کیشیش : کس کے حکم سے؟

مارگس : میرے حکم سے۔

کیشیش : تو کون؟

مارگس : دیکھ۔

(مارگس کا سیدہ کھول کر نشان شاہی دکھانا)

کیشیش : کون شہزادہ مارگس؟ آپ؟

مارگس : چُپ۔

(سپاہیوں کا بھالے جھکا دینا اور حٹا کا مارگس سے لپٹ جانا)

## پہلا ایکٹ — چھٹا سین

### عِزْرَا کا مکان

(ختا اور مارکس آتے ہیں)

ختا : میں جیران ہوں کہ اس روز ان انسان نما درندوں کے زور کس قوت نے گھٹا دیے۔ تم میں وہ کون سی چھپی ہوئی طاقت ہے جسے دیکھتے ہی ظالم رومنوں نے اپنے خونی برچھے اور مغروسر، زمین کی طرف جھکا دیے۔

مارکس : پیاری ختا۔ جس طرح اکثر لوگ سانپ اور بچھوکا منتر جانتے ہیں، اسی طرح ان رومنوں پر قابو پانے کے لیے میرے پاس بھی ایک طسم ہے۔

ختا : مگر دیکھنا پیارے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔

کہیں ایسا نہ ہو، کچھ ان کا اثر ہو جائے

اس وفا اور محبت کو نظر ہو جائے

مارکس : پیاری ختا۔ اگر کچھ سنانے ہی کو جی چاہتا ہے تو جی بھر کر سنالو۔ گرفال بد منہ سے نہ نکالو۔

(عِزْرَا کا اندر آنا)

عِزْرَا : ظالم، بے دین، بیہاں بھی چین سے بیٹھنہیں دیتے۔ ختا۔ ختا۔

ختا : حکم پیارے ابتا۔

عِزْرَا : رومنوں کے بادشاہ کی بھتی اور ولی عہد سلطنت کی میگیت شہزادی آکٹیو یا اس طرف سے گزر رہی تھی۔ اتفاقاً ایک ستون سے ٹکرا کر اس کے رتھ کا پہیہ چور چور ہو گیا اور اس کا شاہی غرور اپنی غریب رعیت سے پناہ اور مدد مانگنے کے لیے مجبور ہو گیا۔

مارکس : تو کیا وہ آپ کے بیہاں قیام کرنا چاہتی ہے؟

عِزْرَا : ہاں۔ دوسری سواری کے آنے یا پہلی کے درست ہو جانے تک وہ پاک قوم کی لڑکی ایک ناپاک یہودی کے گھر میں

ٹھہرنا چاہتی ہے۔

حتا : تو اب اجان جائیے۔ مہمان بن کر آنا چاہتی ہے تو ضرور بلا لائیے۔

مارکس : (خودکلامی) آکٹیو یا اور عزرا کے لئے میں۔ کیا اپنی مگنیٹر کی موجودگی میں میرا راز راز رہ سکے گا۔ (مخاطب ہو کر)

ہاں۔ کیا میں ہٹ جاؤں؟

عورا : کیوں؟

مارکس : شاید شہزادی ایک غیر شخص کی موجودگی پسند نہ کرے۔

عورا : ٹھہرو۔ مجھے اس ناخواندہ مہمان کے آنے کے بعد تمھاری مدد کی ضرورت ہو گی۔

(جانا)

مارکس : (خودکلامی)۔

چغیاں کھائے گا گھر اے ہوئے چہرے کا رنگ

کھول دے گی بھید دونوں پر پریشانی مری

(آکٹیو یا کا عزرا کے ساتھ اندر آتا)

آکٹیو یا : ہاں عزرا۔ گاڑی کے اتفاقی ٹوٹ جانے سے مجھے قدرے تکلیف تو ہوئی تاہم اس تکلیف میں بھی اپنے لیے ایک طرح کی خوشی محسوس کرتی ہوں۔ اگر یہ ناشدنی واقعہ پیش نہ آتا تو مجھے اپنے پچا کی ایک وفادار رعیت کے جو ہر پچانے اور یہودی قوم کی اخلاقی خوبیوں کو جاننے کا کبھی موقع نہ ملتا۔

عورا : میں اس نوازش کا ممنون ہوں۔ اگر حضور کے ہم قوم، ہمارے آقا، ہماری جان و مال کے مالک معزز رومن بھی اپنی رعایا کے ساتھ یہی برتاب رکھیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کی حکومت چاند اور سورج کی عمر پاسکتی ہے۔

آکٹیو یا : (مارکس کو دیکھ کر خودکلامی) تجہب، جیرت۔ کس قدر ملتی جلتی صورت۔ ایک قلم کی دو تصویریں۔ یہودی فریم میں رومن تصویر؟

مارکس : (خودکلامی)۔

آج تو قیم گئی، بات گئی، شان گئی

کچھ بنائے نہ بنے گئی، جو وہ پہچان گئی

آکٹیویا : عزرا۔ یہ نوجوان شخص کون ہے؟  
 عزرا : حضور۔ یہ میرے ایک ہم ندھب کی آنکھ کا تارا ہے اور مجھے اولاد سے بھی زیادہ پیارا ہے۔  
 آکٹیویا : کیوں جونا۔ کیا یہ چہرہ دیکھنے والے کے دل میں حیرت پیدا نہیں کرتا؟  
 جونا : جی ہاں۔ اگر یہ آدمی یہودی کے لباس میں نہ ہوتا تو میں ضرور شہزادہ مارگس سمجھ کر دوڑا نہ ہو کہ اس کے دامن کو بوس دیتی۔  
 عزرا : حضور۔ میں تھوڑی دیر کی غیر حاضری کی معافی چاہتا ہوں۔  
 آکٹیویا : خوشی کے ساتھ۔  
 مارگس : ضرورت ہوتو میں بھی ساتھ چلوں؟  
 عزرا : ٹھہرو۔ کیا انگاروں کے فرش پر کھڑے ہوں؟

(عزرا اور حتا کا جانا)

مارگس : (خودکامی)

یہ کہاں سے آگئی حیران کرنے کے لیے  
 اور دروازے نہ تھے کیا اس کو مرنے کے لیے  
 آکٹیویا : جونا۔ میں اس نوجوان یہودی سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ اس سے کہہ کہ میرے نزدیک آئے۔  
 جونا : ذرا قریب آنا بھائی۔  
 آکٹیویا : جونا۔ میں اپنی زندگی میں اس سے زیادہ کبھی حیرت زدہ نہیں ہوئی جتنی آج اس کی اور اپنے پیارے کی ملتی جلتی صورت دیکھ کر ہوئی ہوں۔

دل پوچھ رہا ہے آنکھوں سے، یہ بہتر یا وہ اعلیٰ ہے  
 قدرت نے ایک ہی سانچے میں کیا دو سکوں کو ڈھالا ہے

(عزرا اور حتا کا دوبارہ آنا)

حتا : (خودکامی)

آنکھوں میں باتیں ہوتی ہیں ہونٹوں پر اگرچہ تala ہے  
 جس چاند کی میں دیوانی ہوں کیا یہ بھی اسی کا ہلا ہے

عبرا : (خودکاری)

اس کے بھی رنگ عجب سے ہیں اس کا بھی طور نرالا ہے  
ہے یہ بھی چپ اور یہ بھی چپ کچھ دال میں کالا کالا ہے  
(سپاہی کا آنا)

سپاہی : حضور عالیہ۔ سواری تیار ہے۔ صرف حضور کا انتظار ہے۔

آکٹیویا : اچھا عبرا۔ میں نے تمھیں بہت تکلیف دی۔ اگر پھر کبھی اس طرف سے گزری تو ضرور تم سے لئے کی خوشی حاصل کروں گی۔

عبرا : حضور کی رعیت نوازی سے مجھے ایسی ہی امید ہے۔

(آکٹیویا، جونا اور سپاہی کا جانا)

مارکس : (خودکاری)

میں تو سمجھا تھا، کہ پوری آج رسوانی ہوئی  
خیر گزری، مل گئی، سر سے بلا آئی ہوئی

ختا : یہ شہزادی تم سے واقف ہے؟

مارکس : اتنا ہی جتنا وہ تم سے واقف ہے۔

ختا : ہوں۔ اس روز رومان سرداروں کا یک بیک تمہارے آگے جھک جانا، آج شہزادی آکٹیویا کا تمھیں دیکھ کر حیرت میں آنا ظاہر کرتا ہے کہ تم پراندھا بھروسہ عقل کا قصور ہے۔ تمہارا رومتوں سے کوئی نہ کوئی پوشیدہ تعلق ضرور ہے۔

مارکس : پیاری ختا۔ اس بات کا جواب دینے کی نہ ممکن ہے اور نہ میں اس کی ابھی ضرورت سمجھتا ہوں۔

(دونوں کا جانا)

## پہلا ایکٹ — آٹھواں سین

### باغ

(مارگس اور حتا کا باتیں کرتے دکھائی دینا)

حتا : بس بس۔ میں اب تشویش اور خوف کی حالت میں ایک نامعلوم مدت تک رہنا نہیں چاہتی۔

مارگس : دماغ خیال کا اور خیال لفظوں کا ساتھ نہیں دیتے۔ مجھے جواب دینے کے لیے کچھ مدت دو۔



خدا : بس آج ہی یا کبھی نہیں۔ میرا دل اس کا نئے کی چھین کو زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔

یہ رنج جائے یہ تکلیف و اضطراب مٹے

کہو کہو کہ کسی طرح یہ عذاب مٹے

مارکس : تو پیاری خدا۔ حقیقت کے چہرے سے نقاب دور ہوتی ہے دیکھو اصلیت کی بھیاں کشکل دیکھ کر خوفزدہ نہ ہونا نفرت نہ کرنا۔ میں آج تک یہودی کے لباس میں ایک دھوکے باز عاشق کا پارٹ کر رہا تھا۔ آہ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

اچھا سنو یہ یہ کہ۔

ہر اک گمان الگ ہے ہر اک یقین الگ

تمہارا دین الگ ہے ہمارا دین الگ

خدا : تو کیا تم ہمارے مذہب نہیں ہو؟

مارکس : نہیں۔ میں تمہارے مذہب کے دشمنوں کی ڈالی ہوئی نیاد ہوں۔ یعنی رومان خون اور رومان باپ کی اولاد ہوں۔

خدا : تم یہودی نہیں ہو؟

مارکس : نہیں۔

خدا : تو پھر تھیس یہودی بننے کو کس نے کہا؟

مارکس : تمہاری محبت نے۔

خدا : بس بے درد بس! ایک دغا بار رومان ایک معصوم یہودی لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔

مارکس : تو کیا تم میری مجبوریوں کا خیال کر کے میرا گناہ نہیں معاف کر سکتیں؟

خدا : نہیں۔

مارکس : تو کیا اپنادل مجھ سے پھیر لوگی؟

خدا : آہ کاش یہ ممکن ہوتا۔ مگر نہیں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ یہی نہیں ہو سکتا۔

(عمر را کا آنا اور پچھپ کر دنوں کی باتیں سننا)

مارکس : تو پھر میرے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے کیوں انکار ہے؟

حنا : اس لیے کہ اس دل پر میرا قبضہ ہے مگر اس ہاتھ پر میرے باپ کا اختیار ہے۔

مارکس : اگر تمھیں انکار ہے تو پھر میرا اس دنیا میں جینا بیکار ہے۔

(اپنے آپ کو خبر مارنے کی کوشش کرتا ہے)

حنا : ٹھہرو۔ پیارے ٹھہرو۔

مارکس : بس ہاں یا نہیں۔ ایک لفظ

حنا : تھوڑی دیر۔ غور کرنے کے لیے، تھوڑی دیر۔

مارکس : ایک منٹ نہیں۔

حنا : آہ...

مارکس : بس کہو کہ مجھے منظور ہے۔

حنا : لے چل خوبصورت جادوگر، لے چل۔ حنا اس دل سے مجبور ہے۔

تیری ہوں، تیرے ساتھ ہوں، دیتی ہوں زبان میں

اب سایہ کے مانند جہاں تو ہے وہاں میں

(دونوں جانا چاہتے ہیں کہ عورا سامنے آ جاتا ہے)

عورا : ٹھہرو۔ کہاں جاتے ہو؟ کہاں بھاگ کر چھپنا چاہتے ہو؟

حنا : رحم۔ پیارے ابا ہم گھنگاروں پر رحم۔

عورا : رحم۔ ایسے ناکار پر رحم تجھ جیسی ناہنجار پر؟ کیا اسی دن کے لیے میں نے تجھے پالا تھا؟ اور کیوں اور مون قوم کے

نجس کتے۔ جس نے ہمیشہ محبت سے تیری بیٹھ کو تھپٹھپایا۔ جس نے تجھے شریف اور وفادار سمجھ کر تیرے منھ پر ٹھوکر

مارنے کے بد لے تجھے اٹھا کر اپنی گود میں بھایا۔ اسی محسن کے لیے میں اپنے زہریلے دانت گڑو نے کے لیے

تیار ہوا۔

حنا : ابا۔ پیارے ابا۔ بے شک ہم دونوں محبت کرنے کے مجرم ہیں مگر ہمارا جرم گناہ کی آلوگی سے پاک ہے۔ اس لیے ہم

سے نفرت کرنا انصاف کے خلاف ہے۔

مارکس : ۔

ہے پاک گناہوں سے ہماری یہ خطاب بھی  
غارت ہوں، اگر ہم کو بدی نے ہو چھوا بھی  
ہم چشمہ الفت میں ہیں مانند کنوں کے  
جو پانی کے اندر بھی ہے پانی سے جدا بھی

عُزرا : تو کیا تم محبت کرنے کے سوا اور ہر طرح بے قصور ہو۔ چاند کی طرح اس زمین کی برائیوں سے دور ہو؟

مارکس : ہاں بزرگ عُزرا۔ ایسا ہی ہے۔

عُزرا : افسوس۔ میں نے کیا سوچ رکھا تھا اور یہاں کیا واقعہ روپہ کار ہے۔ حق ہے جس طرح دریا کی رو کے سامنے ایک تنکا  
بے بس ہے۔ اسی طرح تقدیر کے آگے تدبیر ناچار ہے۔

حَّـ : ابا۔ پیارے ابا۔

عُزرا : تو کیا تم اسے عزیز رکھو گے؟

مارکس : اپنی جان کی طرح۔

عُزرا : اچھا تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں اور خوشی سے اس کا ہاتھ تمحارے ہاتھ میں دیتا ہوں آگے بڑھو۔ دوز انو  
ہو۔ نہیں سن۔ دوز انو ہو۔

مارکس : کیا آپ مجھ سے کوئی مزید اقرار کرانا چاہتے ہیں؟

عُزرا : ہاں۔ بغیر مذہب بدلتے۔ ایک رومان، یہودی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔ اس لیے سب سے پیش تر تھیں اسرائیلی  
عقائد کی تعلیم دے کر اپنے مذہب میں لاوں گا اور پھر موسیٰ شریعت کے مطابق تم دونوں کا ہاتھ ملا کر باپ کے  
فرض سے ادا ہو جاؤں گا۔

مارکس : ۔

کس کو چاہوں، کس کو چھوڑوں، کٹگاش میں جان ہے  
اک طرف یہ حور ہے اور اک طرف ایمان ہے

عُزرا : جواب دو۔ کیا خیال ہے؟

مارکس : میں حتا کو چھوڑ سکتا ہوں مگر اپنا نہ ہب چھوڑنا محال ہے۔

عبرا : تو پھر نہیں؟

مارکس : نہیں۔

عبرا : تب کیا۔ رومن قوم کے ذیل کتے۔ کیا تو مخصوصیت کے معبد میں گناہوں کی بدبو پھیلانے، فتن و فنور کا جال بچا کر ایک بھولی بھالی بڑکی کو حرام کاری کا راستہ بتانے آیا تھا۔

حتا : پیارے۔ میرے پیارے۔ یہ کیا؟

ہم وہی اور تم وہی پھر یہ بیک کیا ہو گیا

با وفا دل آج کیوں بے درد ایسا ہو گیا

مارکس : حتا۔ میری قوت فیصلہ بیکار ہو گئی۔ میرے چاروں طرف تاریکی چھاگئی۔ اب مجھے جانے دو۔  
(پرده)

## دوسرا ایکٹ — پہلا سین

### شاہی محل

(مارکس اور آکٹیویا کا آنا)

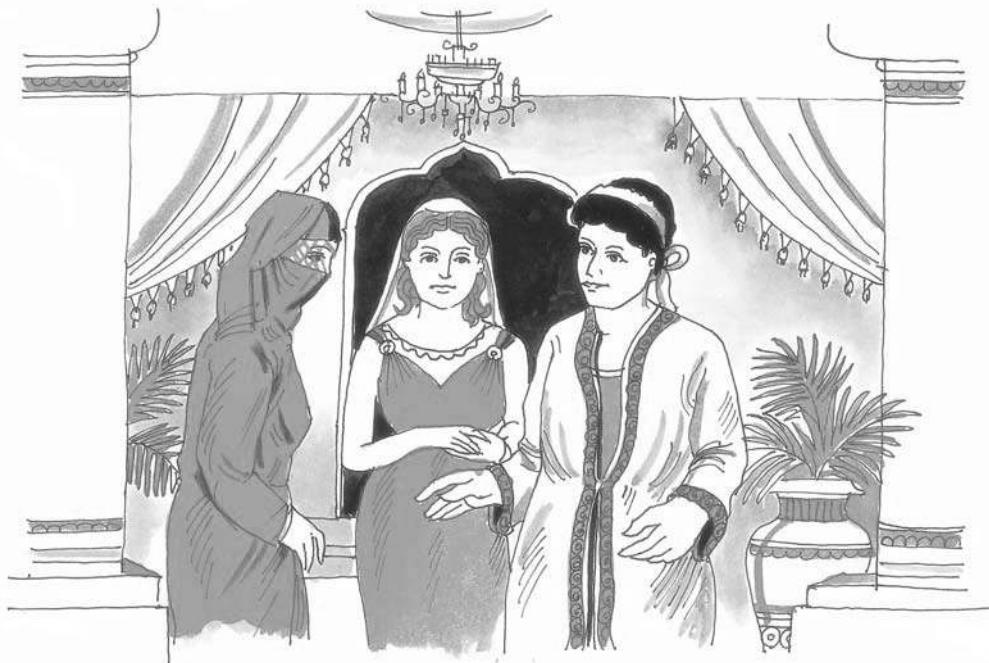
مارکس : پیاری آکٹیویا۔ حق، شرابی اور پاگل، ان میں سے کوئی جرم کرے تو درگذر کی جاسکتی ہے مگر جس گناہ میں عقل تیز اور ارادہ شامل ہوا سے چشم پوشی نہیں ہو سکتی۔ میں کس منھ سے معدالت پیش کروں؟

آکٹیویا : میرے دل کے مالک۔ انسان اور غلطی ایک ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ جو گناہ نہیں کرتا وہ بے شک سزاوار تو صیف ہے۔ مگر جو گناہ کر کے نادم ہوتا ہے اور تلافی کرتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ قابل تعریف ہے۔

مارکس : تب تم میری گذشتہ بے اعتنائیوں کو معاف کرتی ہو؟

آکٹیویا : میرے پیارے بار بار معافی کا لفظ دھرا کر مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو؟  
(آکٹیویا کا جانا)

مارکس : (خود کلامی) دغabaز مارگس۔ بے وقار من۔ تو کتنا ذلیل شخص ہے؟ کہ زبان سے آکٹیویا کے ساتھ محبت کا اظہار کر رہا ہے۔ مگر تیرا دل ابھی تک ختا کو پیار کر رہا ہے۔ کیا ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ کرے گا؟ کیا ایک شریف یہودن کی زندگی اور اس رومن شہزادی کا بھی حال مستقبل تباہ کرے گا؟  
 (جانا چاہتا ہے کہ ختا آتی ہے)



ختا : ٹھہرو۔

جاتے کہاں ہو مجھ کو ٹھکانے لگا کے جاؤ  
 مارا ہے جس کو اس کا جنازہ اٹھا کے جاؤ

مارکس : ختا۔ تم اور یہاں؟

ختا : ہاں۔

مارکس : کیوں آئیں۔ کس کے پاس آئیں؟

حنا : اپنے صیاد کے پاس۔ قتل کر کے بھول جانے والے جلا دے کے پاس۔  
 مارکس : حنا۔ تم آج سے پہلے مجھے کیا سمجھتی تھیں؟

حنا : ایک نیک یہودی۔

مارکس : اور اب کیا سمجھتی ہو؟

حنا : ایک بے وقار و مکن۔

مارکس : لیکن میں نہ وہ تھانہ یہ ہوں۔

حنا : تو پھر۔

مارکس : میں سلطنت روم کا ولی عہد یعنی اس ملک کا ہونے والا شہریار ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنا مذہب تبدیل کرنے سے لاچا رہوں۔

حنا : تم ولی عہد ہو؟ اس ملک کے ہونے والے بادشاہ ہو؟

مارکس : ہاں۔ اب تم ہی منصف ہو۔ اگر میں تمہارے باپ کی شرط منظور کر لیتا تو مجھے مذہب کے ساتھ سلطنت کی امید بھی چھوڑ دینی پڑتی۔

حنا : تو کیا سلطنت کچی محبت سے زیادہ قیمتی ہے۔ شاہی تخت عورت کے پاک دل سے زیادہ مقدس ہے۔ غلاموں اور درباریوں کا شور تباہی میں گونجتی ہوئی پیار کی راگنی سے زیادہ بیٹھا ہے۔ شہزادے صاحب۔ اگر مرد کو دنیا میں عورت کی کچی محبت مل جائے تو اسے سلطنت کیا بہشت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

مارکس : جو ہو چکا اُس کا باعث مجبوری ہو یا بھول لیکن اب میں دوبارہ وہ خواب نہیں دیکھ سکتا۔

حنا : کیوں؟

مارکس : کیونکہ کل شہزادی آکٹیویٹی سے میری شادی ہونے والی ہے۔

حنا : شادی؟

مارکس : ہاں۔

حنا : کان مجھے دھوکا تو نہیں دیتے، اپنے لفظوں کو پھر دھراو۔ شہزادی آکٹیویٹی سے تمہاری شادی ہو گی؟

مارکس : ہاں۔ ہاں۔

حنا : ظالم بے درد۔ تو کیا اسے بھی اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر مجھنا شادو نامرا دی کی طرح اس غریب کی جوانی اور زندگی

کو بھی خاک میں ملانا چاہتا ہے۔ اُس منہوس دن کا سورج کبھی طلوع نہ ہوگا میں تیرے بھولے شکار کو ہوشیار کر دوں گی کہ تو فرمبی ہے، جھوٹا ہے، دغاباز ہے۔ یہ شادی ایک عورت کی زندگی کا انجام اور دوسری عورت کی بناہی کا آغاز ہے۔

مارکس : مگر یہ شادی کل کے دن مقرر ہو چکی ہے اور کل کا دن مقرر کے فیصلے کی طرح اُل ہے۔

حنا : تو مقرر کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ شادی ہرگز نہ ہوگی۔

مارکس : یہ ناممکن ہے۔

حنا : اگر یہ ناممکن ہے تو میں یہ سمجھوں گی کہ ظالموں اور موزیوں کے لیے میدان صاف ہے۔ روم میں نہ کوئی بادشاہ ہے، نہ قانون ہے، نہ انصاف ہے۔

باطن میں بزرے ہیں بظاہر دلیر ہیں

یہ دور سے ڈرانے کو مٹی کے شیر ہیں

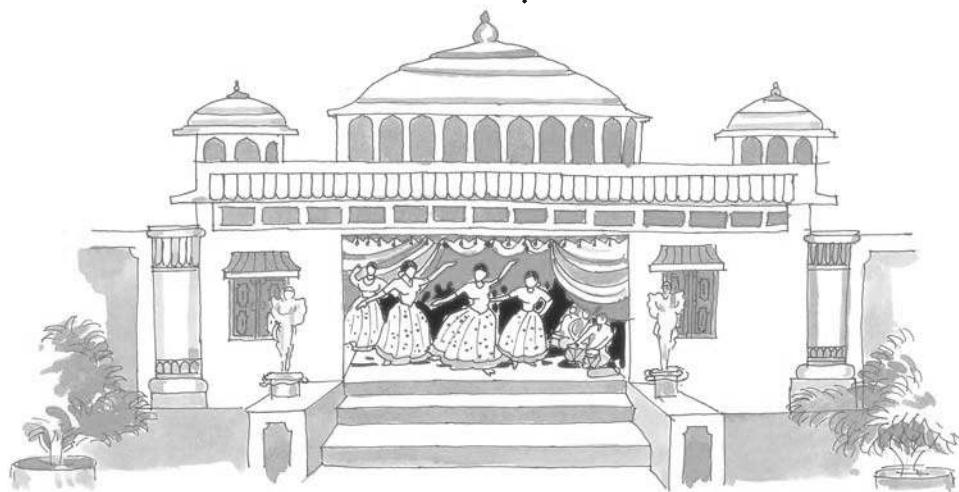
مارکس : ہشت۔

(جانا)

## دوسرًا ایکٹ—دوسرے سین

دربار

(سمیلیوں کا ناپتے گاتے دکھائی دینا)



**چوبدار :** دولت و اقبال پائندہ، رعایاۓ روم کے رواج قدیم کے مطابق اس شہر کا مشہور سوداگر عزرا یہودی اپنی قوم کی طرف سے عقیدت مندانہ نذرانہ پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا ہے اور عالی مرتبہ شہزادی سے شرف حضوری کی اجازت چاہتا ہے۔

**آکٹیویا :** کون آیا ہے؟ عزرا۔ وہ یہودیوں میں سب سے زیادہ شریف و معزز بوڑھا۔ میں اسے دیکھ کر ضرور خوش ہوں گی۔ حاضر کرو۔

**بروُس :** (خودکلامی) دیوتا خیر کریں۔ یہ نبوست کی نشانی، مصیبت کا پیش نیمہ اس ہنسی خوشی کے جلسے میں کہاں سے نازل ہوا؟ (مخاطب ہو کر) شہزادی رواج کی سر پرستی جلسے سے باہر بھی ہو سکتی ہے۔ حکم دیجیے کہ نذرانہ لے کر اس نامبارک عبرانی کو دروازے ہی سے واپس کر دیا جائے۔

**آکٹیویا :** بزرگ باپ۔ ایک بے ضرر یہودی سے اتنی نفرت؟ کیا وہ کوئی چور یا خونی ہے؟

**بروُس :** وہ ایک کافرنعمت۔ سنگ دل۔ زر پرست۔ دیوتاؤں کی راندہ اور دنیا کی مردود کی ہوئی قوم کا ایک شخص ہے۔ اس لیے اس مبارک جلسے میں اس کا شریک ہونا سخت بدشگونی ہے۔

**آکٹیویا :** مگر اس کی موجودگی سے ہمارا کیا نقصان ہو سکتا ہے؟

**بروُس :** راتوں کو ایک کونے میں بیٹھ کر رونے والا کتنا کیا نقصان پہنچاتا ہے جو فوراً محلہ سے مار کر بھگا دیا جاتا ہے۔ مکان کی چھت پر بیٹھ کر غم زدہ آواز میں بولنے والا اُو کیا تکلیف دیتا ہے جو فوراً بانس اور ڈھیلوں سے اڑا دیا جاتا ہے۔ جس طرح یہ دونوں اپنی موجودگی سے نبوست پھیلاتے ہیں اسی طرح یہ بخس یہودی بھی جہاں جاتے ہیں کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور ساتھ لے جاتے ہیں۔

(عزرا کا داخلہ)

**آکٹیویا :** عزرا۔ خوش آمدید۔ تمہیں اس خوشی کے جلسے میں دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔

**عزرا :** معزز شہزادی۔ سلطنت آپ کے گھر میں موجود ہے۔ زریں لباس آپ کے تو شہ خانے میں بھرے پڑے ہیں۔ زر و جواہر آپ کی ٹھوکروں میں کھیلتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی چیز نہیں جس کی آپ کو پرواہ و ضرورت ہو۔ اس لیے میں اپنی اور اپنے قوم کی طرف سے ان کے دلوں کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعاوں کا لازوال تھنہ پیش کرتا ہوں۔ اسے قبول فرمائیے۔

**آکٹیویا :** میں اس تھنے کو تمام دنیا کے خزانوں سے زیادہ قیمتی سمجھتی ہوں۔

عمراء : اس فراغ مشربی و بے تعصی کے صلے میں اُس آسمانی خدا کی بہترین برکتیں آپ پر سایہ گسترش ہوں۔ اور اُس ملعون رومن پر جس نے میری بھولی بچی کی راحت و زندگی تباہ کر دی، بہترین عذاب نازل ہو۔

بروُس : عزیز شہزادی۔ اگر اس نجس یہودی کی موجودگی ضروری ہے تو پہلے اسے مندر میں بھیج کر پاک بنایا جائے۔ اس کے بعد شادی کے جلسے میں بلا یا جائے اور شرکائے جلسہ کی رو حیں اس کی پرچھائیں پڑنے سے گندی نہ ہو جائیں، اس لیے احتیاطاً دور بٹھایا جائے۔

سردار 1 : ناقابت اندیش یہودی خاموش رہ۔ کیا زندگی سے نامید ہے؟ (بروُس سے مخاطب ہو کر) بزرگ باپ۔ ایک فرسودہ حواس بوڑھے کو اپنا مخاطب بنانا آپ کے رتبہ اور شان سے بعد ہے۔

بادشاہ : میں بھی اس رائے کو پسند کر کے آپ کو اس کی احمقانہ جرأت سے چشم پوشی کرنے اور اس یہودی کو خاموش رہنے کا حکم دیتا ہوں..... اٹھیے اور میرے عزیز بچوں کو شادی کی برکت دیجیے۔  
(بروُس کا اٹھ کر مارگس اور آکٹیویا کا ہاتھ ملانا)

بروُس : ۔

خوش اور ایک دوسرے پر مہرباں رہو

دنیا میں بامداد رہو شادمان رہو

(ختا کا آنا)

ختا : ٹھہرو۔ جب تک انصاف کی عدالت میں بادشاہ عادل کے رو برو ایک باوفا کی عرضی پیش ہو کر دغا بازی کے مقدمے کا فیصلہ نہ ہو لے۔ اُس وقت تک ٹھہرو۔

بادشاہ : یہ کون؟

بروُس : تو کون؟

مارگس : (خود کلامی) ۔

باعثِ تکلیف راحت میں گراں جانی ہوئی  
سن رہا ہوں صاف اک آواز پہچانی ہوئی

عمراء : ختنا۔ تو یہاں کیوں آئی؟

ختا : انصاف کے لیے۔

عورا : کیا تجھے یقین ہے کہ ایک رومن شہزادے کے بخلاف ایک یہودی لڑکی کی فریاد سنی جائے گی؟

حنا : اگر اس دربار کا دعویٰ ہے کہ بہاں امیر و غریب دونوں کا یکساں انصاف ہوتا ہے تو اس دعوے کی شرم رکھنے کے لیے اسے میری فریاد سننی پڑے گی۔

بادشاہ : اجنبی لڑکی۔ صاف لفظوں میں حال بیان کر۔ اگر تو مظلوم ہے تو تیرا حریف چاہے شاہی نسل ہی کا آدمی کیوں نہ ہو مگر انصاف ضرور تیری طرفداری کرے گا۔ بول۔ کس کی ستائی ہے؟ اور کس کے خلاف فریاد لائی ہے؟

حنا : مجھے ستانے والا، دین و دنیا سے مٹانے والا۔

جفا پیشہ، وفا دشمن، ستم گر کون ہے؟ یہ ہے

شکایت جس کی کرتا ہے مقدر کون ہے؟ یہ ہے

آکٹیویا : کون؟ شہزادہ مارگس؟

بادشاہ : ولی عہد سلطنت؟

حنا : یہی، یہی۔

بادشاہ : مارگس۔ سنتا ہے؟ اس الزام کا تیرے پاس کیا جواب ہے؟

مارگس : ۔۔۔

ستائی گئی ہے، مُرا کہہ رہی ہے

یہ جو کہہ رہی ہے بجا کہہ رہی ہے

آکٹیویا : دیوانی عورت۔ الزام لگانے سے پہلے انجام سوچ لے۔

حنا : بچی۔ بچی۔ شہزادی صاحبہ۔ اس خوبصورت سانپ کے زہر سے بچی۔

آکٹیویا : بس بس خاموش۔ میں اپنے پیارے کی نسبت ایسا کوئی لفظ سنا نہیں چاہتی جس سے اس کی توہین ہو۔

حنا : شہزادی۔

سر اسر مکر، سرتاپا دغا، نا آشنا ہے یہ

مری آنکھوں سے دیکھو تم تو ہو معلوم کیا ہے یہ

کنواری رہنا بہتر جانیے اس عقد ہونے سے

وفا کی ہے عبث اُمید مٹی کے کھلونے سے

- بروں : عالم پناہ اگر میری نصیحت قبول فرمائیں تو میں یہ کہوں گا کہ عورت کے بیان پر کبھی یقین نہ کرنا چاہیے۔
- عورا : سریر آرائے عدالت، سلطنت کا ایک معزز رکن ہو کر انصاف کے راستے میں روٹا اٹکانا، دباؤ ڈال کر شاہی انصاف اور شاہی رائے کو ایک مظلوم فریادی کے خلاف بنانا کیا ان جیسے مقدس اور مذہبی پیشواؤں سے اوار ہے۔
- بادشاہ : کیا سلطانِ عادل کا انصاف مظلوموں کا سرپرست ہونے کے بدلے ظالموں کا طرفدار ہے؟
- عورا : نہیں عبرانی کبھی نہیں۔ جس طرح آتاب کی روشنی، امیر کے محل اور غریب کے جھونپڑے میں کوئی فرق نہیں کرتی اسی طرح میں بھی انصاف کے وقت ادنیٰ اور اعلیٰ سب کو یکساں جانتا ہوں۔ اپنی ذمہ داری اور اپنا فرض اچھی طرح پیچانتا ہوں۔
- عورا : بس تو پھر جگہ انصاف ہے۔ آج کے روز آپ کے لیے صرف ایک ہی کام ہے اور وہ ان دونوں کا انصاف ہے۔
- بادشاہ : میں انصاف کو استعمال کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت صرف کر دوں گا۔
- حنا : خدا آپ کو مظلوموں کی حفاظت کے لیے قیامت تک زندہ رکھے۔ فرمائیے۔ آپ کی رعایا میں سے اگر کوئی شخص شادی کا وعدہ کر کے کسی عورت کو اپنی محبت میں گرفتار کرے اور اسے چھوڑ کر کسی دوسری عورت کو اپنی دنگابازی کا شکار کرے تو حضور والا کا قانون اس کے لیے کیا سزا تجویز کرتا ہے؟
- بادشاہ : موت۔ بغیر حرم کے موت۔
- عورا : بس تو ہو چکا۔ فیصلہ ہو چکا۔ آپ شاہی نام کی عزت ہیں۔ تخت سلطنت کے اہل ہیں۔ قلم اٹھائیے اور ولی عہد کے سزاے موت کے کاغذ پر دستخط فرمائیے۔
- بادشاہ : مگر مجھے پہلے اس کا گناہ تو معلوم ہونا چاہیے؟
- حنا : یہ آپ کی عزت اور شہرت کو بر باد کرنے والا، اس ملک کی غریب اڑکیوں کے سر پر بتاہی لارہا ہے۔ اس نے شادی کا وعدہ کر کے پہلے مجھے دھوکا دیا اور اب شہزادی آکٹیویا کو اپنی پُرد فریب محبت کے پھندے میں پھنسا رہا ہے۔
- بادشاہ : مار گس۔ سنتا ہے؟ اٹھ کھڑا ہو۔ اس کا جواب دے۔ ورنہ بدترین قسم کی سزاے موت تیرے لیے تیار ہے۔
- مارگس : بے شک غلام اس کا خطواہ ہے اور عاجزی کے ساتھ حضور والا سے حرم کا امیدوار ہے۔
- بادشاہ : رحم یہ کر سکتی ہے میں نہیں کر سکتا۔
- بروں : خاقانِ عالم۔
- بادشاہ : بس۔

بروں : عالی جاہ۔  
بادشاہ : کچھ نہیں۔  
بروں : یہ نہ ہونا چاہیے۔  
بادشاہ : یہ ضرور ہوگا۔  
بروں : میری یہ عرض ہے کہ قانون مگر اہوں کے واسطے ہے نہ کہ بادشاہوں کے واسطے۔  
بادشاہ : مگر انصاف کی تلوار آقا اور غلام دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے۔  
بروں : عشق کا جوش ایک طرح کا جنون ہوتا ہے۔  
حنا : تو یہ کیوں نہیں کہتے کہ امیروں کے سرتو تعالیٰ زر کے لیے ہیں اور غربیوں کے سر امیروں کی ٹھوکروں کے لیے ہیں۔  
بروں : بے شک۔  
عرا : واہ رے مذہب اور واہ رے مذہبی پیشوں۔

تم حمارا غم ہے غم، مفلس کا غم بس اک کہانی ہے  
تم حمارا عیش ہے عیش اور ہمارا عیش فانی ہے  
یہاں بچپن بڑھایا وال بڑھا پا بھی جوانی ہے  
تم حمارا خون ہے خون اور ہمارا خون پانی ہے  
یہ نخوت اور یہ زر کیا لے کے اپنے ساتھ جائے گا  
یہیں رہ جائے گا سب یاں سے خالی ہاتھ جائے گا

حنا : عادل سلطان۔ اب مجھے انصاف ملنے میں کیا دیر ہے؟ اگر آپ نے ابھی تک نہ سنا ہو تو میں اس سے بھی زیادہ بلند آواز سے انصاف پکار سکتی ہوں۔  
بادشاہ : اُف کیا کروں اور کیا نہ کروں؟  
عرا : عادل بادشاہ۔ کیا بیٹھے کی محبت اور انصاف میں جگ ہو رہی ہے؟  
بادشاہ : ہاں۔ مگر فتح انصاف ہی کو ملے گی۔  
حنا : تو پھر انصاف ملنا چاہیے۔  
بادشاہ : ضرور ملے گا۔

حنا : آپ سے؟  
 بادشاہ : ہاں مجھ سے۔  
 حنا : کہاں؟  
 بادشاہ : یہاں۔  
 حنا : کب؟  
 بادشاہ : اسی وقت۔ بڑھوائے شاہی حکم کے پرستارو۔ اس ناخلف کو حراست میں لے لو اور کل مذہبی عدالت میں انصاف  
 کے لیے پیش کرو۔  
 بروس : حضور والا۔  
 بادشاہ : خبردار۔ جو ایک لفظ بھی زبان سے نکالا۔  
 (موسیقی)

## دوسری ایکٹ—چوتھا سمین

### محل

(آکٹیویا کا آنا)

آکٹیویا : میری پیاری بہن، اتنی خخت نہ بن۔ نرمی اور حم جو عورت کی بہترین صفتیں ہیں، ان کو غصے پر قربان نہ کر۔ بُرے کے ساتھ تو بھی بُری نہ بن۔  
 حنا : نہیں ہرگز نہیں۔ اب اس کے لیے ایک سوئی کی نوک کے برابر بھی میرے دل میں جگہ نہیں ہے۔  
 آکٹیویا : دیکھو میں بھی تمہاری طرح ایک عورت ہوں اور معزز قوم کی عورت ہوں۔ ساتھ ہی ایک بادشاہ کی بیٹی اور دوسرے بادشاہ کی بیٹجی ہوں مگر اس پر بھی اس کی زندگی بھیک میں پانے کے لیے ایک نقیرنی کی طرح تمہارے سامنے دامن پھیلاتی ہوں۔

حنا : بچاؤں گی۔ بچاؤں گی۔ جب تم اور یہ دل دنوں اس کی طرفداری کرتے ہیں، تو ضرور بچاؤں گی۔

جاوہ اور کہہ دو وفا کی شرط پوری کر گئی

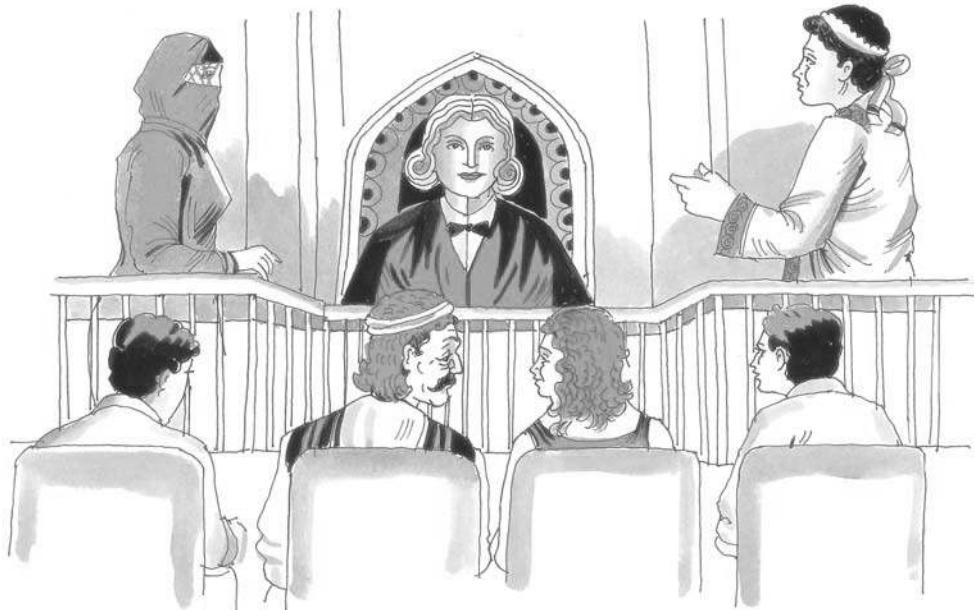
تم رہو جیتے کہ تم پر مرنے والی مرگی

## دوسرا ایکٹ — پانچواں سین

### مذہبی عدالت

(مارگس اور حنا کا الگ الگ کھڑکوں میں کھڑے دکھائی دینا ایک طرف عزرا اور دوسری طرف آکٹیویٹس کا بیٹھے ہوئے نظر آنا۔ برؤس کا اجلاس کی کرسی پر بیٹھنا۔ چند سپاہیوں کا حنا اور مارگس کو اپنی حراست میں لینا)

برؤس : حنا تو ہوش میں ہے؟



حتا : ہاں۔

بروُس : تمھر پر کوئی دباؤ تو نہیں ڈالا گیا؟

حتا : نہیں۔

بروُس : تو بنا جبر و اکراہ اپنا پہلا بیان واپس لیتی ہے؟

حتا : پیشک

عبرا : حتا۔ حتا۔ کیوں محبت میں اندر گی بن رہی ہے؟

حتا : اس لیے کہ کچھ سمجھائی نہیں دیتا۔

عبرا : کیوں اپنے ہاتھوں سے قبر تیار کر رہی ہے؟

حتا : اس لیے کہ قبر میں جاؤں گی تو ایک بے وفا کے ظلم سے نجات پاؤں گی۔

عبرا : عدالت اس کی باقتوں کا یقین نہ کرے۔ یقیناً اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

بروُس : حتا۔ میں روم کے قانون کے مطابق تم سے تیسری مرتبہ دریافت کرتا ہوں کہ تو شہزادہ مارکس پر لگائے ہوئے تمام اذامات واپس لیتی ہے؟

حتا : ہاں۔ لفظ بے لفظ

عبرا : آہ

بروُس : یہودی۔ چونکہ تم بھی اس دعوے میں تائید کرنے والے تھے اس لیے اب تم کیا کہتے ہو؟

عبرا : جس قدر افریقہ کے بیان میں ریت کے ذرے ہیں ان سے بھی زیادہ میرے پاس بولنے کے لیے الفاظ تھے لیکن اس ناقبت اندریش چھوکری کی وجہ سے میں اب کچھ کہنا نہیں چاہتا اور قسمت کے فیصلے کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔

بروُس : تو اب میرا صرف اتنا فرض رہ گیا ہے کہ اپنا آخری حکم سنادوں.... شہزادہ مارکس آپ کو عزت و آبرو کے ساتھ رہا کیا جاتا ہے... اور حتا اور عبرا، تھیں ایک روم کی شہزادے پر جھوٹا اذام لگانے کے جم میں زندہ آگ میں جلائے جانے کی سزا دی جاتی ہے۔

حتا : سزا۔ کس کو؟ مجھ کو یا میرے باپ کو؟

بروُس : دونوں کو۔

حنا : مگر یہ انصاف کے خلاف ہے۔

بروُس : میرا یہ فیصلہ مطابق انصاف ہے۔

حنا : ارنے نہیں نہیں۔

بروُس : قانون اپنے فیصلے میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں دیکھتا... جاؤ اور اپنی قسمت کے موجودہ فیصلے کو صبر کے ساتھ برداشت کرو۔

مارکس : بزرگ باپ اپنے شہزادے اور اس ملک کے ہونے والے بادشاہ پر ایک عنايت۔

بروُس : کیا؟

مارکس : تحوتی شفقت۔

بروُس : یعنی؟

مارکس : اپنی طاقت اور اثر کو کام میں لایئے۔ جس طرح ممکن ہوان دونوں کی جان بچائیے۔

بروُس : مگر عدالت؟

مارکس : وہ آپ کے قبضے میں ہے۔

بروُس : قانون؟

مارکس : وہ آپ کا حکم ہے۔

بروُس : موجودہ فیصلہ؟

مارکس : وہ آپ کی رائے ہے۔

بروُس : بادشاہ کی مرضی؟

مارکس : وہ آپ کی مٹھی میں ہے۔

بروُس : اپنے فیصلے کی آخری سطریں لکھتے وقت جب میں نے اس یہودی دو شیزہ کے بھولے چہرے کی طرف دیکھا تو ایک نامعلوم جذبے کے اثر سے میری انگلیاں قفر قرانے لگی تھیں اور اب بھی جب کہ یہ موت کی طرف جا رہی ہے۔

اپنی روح میں ایک عجیب ولولہ اور اضطراب محسوس کر رہا ہوں... اچھا آپ جائیے۔ مجھ سے جو ممکن ہو گا وہ کروں گا۔

**مارکس** : تو میں ان دونوں کی زندگی آپ کو بطور امانت کے پہر کرتا ہوں۔

**بروُس** : میں کوشش کروں گا کہ دیانت دار امین ثابت ہوں (مارکس جاتا ہے) حتماً اپنے باپ کو پیار کرتی ہو؟

**عُزرا** : اپنے مذہب کی طرح۔

**بروُس** : اولاد کے لیے ماں باپ اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں؟

**عُزرا** : یقیناً۔

**بروُس** : تو اولاد کی سلامتی کے لیے تھیس روایت پستی کے عقائد کو نثار کرنا ہو گا۔ جان چانا چاہتے ہو تو اپنے بزرگوں کا مذہب چھوڑ کر تم دونوں کو رومن دین اختیار کرنا ہو گا۔

**عُزرا** : فکر، دکھ، بیماری اور بڑھاپے کے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی زندگی کی قیمت، مذہب سے ادا کروں؟ اس چند روزہ دنیا کے لیے ابراہیم اور موسیٰ کے خدا سے دعا کروں؟

**بروُس** : میں نے تیری قوم کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ اسی کی مستحق تھی مگر اب میری رحم دلی دیکھ کہ تجھے سراسر مجرم پاتا ہوں اور پھر بھی تیری جان بچاتا ہوں۔

**عُزرا** : جان۔ جان کی اب مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ البتہ اتنی آرزو ہے کہ مرنے سے پہلے، ایک قاتل، پرفن، بے رحم رومن کا سب کس بل نکال دوں۔ اس کے پھر جیسے کلیجے میں چکلیاں لے کر سوراخ ڈال دوں۔

**بروُس** : میں تجھے سخت بیوقوف پاتا ہوں۔

**عُزرا** : میں تجھے آج سے سولہ برس پہلے کا واقعہ یاد دلاتا ہوں۔ جس وقت شاہ نیرو کے حکم سے شہر دما میں چاروں طرف آگ بھڑک رہی تھی، اُس وقت تیرے گھر میں ایک خوبصورت یووی اور اس کی گود میں ایک چھ ماہ کی بچی تھی۔

**بروُس** : اس بات کی یاد دلانے سے تیری مراد کیا ہے؟

**عُزرا** : میں پوچھتا ہوں کہ ان دونوں کے آگ میں جل جانے کا واقعہ تو تجھے یاد ہے؟

**بروُس** : ہاں۔ میں اُس منحوس دن کو، جس روز موت نے میری یووی اور بچی کو مجھ سے چھین لیا، کبھی نہیں بھول سکتا۔

**عُزرا** : نیرو کی آگ تیری یووی کے لیے آتشیں کفن ثابت ہوئی مگر اس کے سینے سے لٹپٹی ہوئی تمحاری چھ ماہ کی معصوم بچی،

جو مردہ لاش پر قدرت کی آنکھ سے ٹپکا ہوا افسوس کا آنسو معلوم پڑتی تھی.....

بروُس : کیا وہ زندہ رہی؟

عُزرا : ہاں۔

بروُس : اور ابھی تک زندہ ہے؟

عُزرا : ہاں

بروُس : اسے کس نے بچایا؟

عُزرا : خدا کی ذات نے

بروُس : کس نے آگ سے نکالا؟

عُزرا : نہیں بتا سکتا۔

بروُس : اس کا ٹھکانہ؟

عُزرا : نہیں بتا سکتا۔

بروُس : اُس سے ملنے کا طریقہ؟

عُزرا : نہیں بتا سکتا

بروُس : نہیں عُزرا تجھے بتانا ہو گا۔

عُزرا : ہرگز نہیں۔ یہ میرا راز ہے، جو میری جان کا دم ساز ہے۔

بروُس : عُزرا۔ عُزرا۔ مجھ پر حم کر۔

عُزرا : رحم۔ رحم۔ آج یہ پہلا روز ہے کہ رحم کا لفظ تمہاری زبان سے نکلا اب تو تمھیں معلوم ہو گا کہ رحم کی ضرورت

مظلوم یہودیوں ہی کو نہیں بلکہ ظالم رہنوں کو بھی ہوا کرتی ہے۔ ایک نگال مفلس یہودی کے پاس رحم کہاں سے آیا؟

جاوہ اپنے بے در قانون سے مانگو۔ اپنی ظالم قوم سے طلب کرو۔ اپنے نامنصف دیوتاؤں کے آگے ہاتھ پھیلاؤ۔

بھیک مانگو۔ گڑ گڑا۔

بروُس : بتادے عُزرا۔ بتادے میں اپنے قصوروں کی تجھ سے معافی چاہتا ہوں اور سر جو مذہبی پیشووا کا تاج پہننے کے بعد اس

ملک کے بادشاہ کے سامنے بھی نہیں جھکا، آج تیرے قدموں پر جھکاتا ہوں۔

عمراء : کیوں؟ کیسا جھٹکا لگا؟

بروُس : تو انکار؟

عمراء : لا کھ بار۔

بروُس : نہیں جواب دے گا؟

عمراء : نہیں۔

بروُس : نہیں بتائے گا؟

عمراء : نہیں۔

بروُس : نہیں رحم کرے گا؟

عمراء : نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔

بروُس : اچھا نہیں تو نہیں سہی۔ اب میں زبردستی تیرے سینے سے یہ راز اگلواؤں گا۔ تیری ایک ایک بولی کا قیمہ کر کے اپنے کتوں کو کھلواوں گا۔ جاؤ لے جاؤ۔

رکھے اسے بھی وہیں، جس جگہ یہ آپ رہے

اب اس زمین پر بیٹی رہے نہ باپ رہے

حَتَّا : اے رومن سردار۔

بروُس : مردار۔

عمراء : خبردار۔

(پرده)

## تیسرا ایکٹ — پہلا سین

راستہ

(ختا سپاہیوں کے ساتھ قید خانے کی طرف جاتی دکھائی دیتی ہے)



## تیسرا ایکٹ—دوسرے میں

### دارالعذاب

بروُس : عزرا! تو دعویٰ کرتا ہے کہ یہودی ہم رومنوں سے مذہب، نیکی اور فراغ دلی میں افضل ہیں؟

عزرا : بے شک

بروُس : تو اس کا ثبوت دے۔

عزرا : کس طرح؟

بروُس : ثابت کر کر کہ تو درگذر اور نیکیوں کا دلدادہ ہے۔ ثابت کر کہ تیری روح میں انتقام سے رحم کا مادہ زیادہ ہے۔

عزرا : مگر میں رحم کس پر کروں؟

بروُس : مجھ پر۔

عزرا : سب ہو گا۔ یہی نہیں ہو گا۔

بروُس : عزرا جو مغلس ہے وہ دولت چاہتا ہے۔ جس کے پاس دولت ہے وہ خطاب چاہتا ہے۔ جس کے پاس خطاب ہے وہ حکومت چاہتا ہے۔ میں تمھیں یہ تمام چیزیں یک وقت دینے کو یتار ہوں۔ یہ سب لے لے اور اپنے دل کا راز مجھے دے دے۔

عزرا : خود غرضِ رومن۔ تیرے ظلم و ستم کا کفارہ دولت سے ادا نہیں ہو سکتا۔ دولت اور خطاب زندگی کے خیالی سائے ہیں۔ اگر تو تمام دنیا کی دولت سمیٹ کر مجھے دے دے، تو بھی یہ ان آنسوؤں کی قیمت نہیں ہو سکتی جو تیرے ظلم و ستم نے مظلوموں کی آنکھوں سے ٹپکائے ہیں۔

بروُس : تو ظلم کر رہا ہے۔

عزرا : مجھ سے تھوڑا۔

بروُس : تو بے رحم ہے۔

عزرا : مجھ سے کم۔

بروُس : تو جہنم میں جائے گا۔

عورا : تیرے بعد۔

بروُس : تو نہیں؟

عورا : نہیں۔

بروُس : کب تک؟

عورا : موت تک۔

بروُس : اچھا تو دونوں کو حوالہ عذاب کرو۔ موت کے کڑوے پیالے کو اور زیادہ کڑوا بنانے کے لیے، باپ سے پہلے بیٹی کو کباب کرو۔

حنا : ابا پیارے ابا۔ مرنے سے پہلے مجھے برکت دو کہ میرے دل سے موت کا خوف نکل جائے اور عورت کی نظرت بات پر جان دینے والے مرد کے ارادے سے بدل جائے۔

عورا : اُف! اس لڑکی کی محبت اور میرے ارادے میں جنگ شروع ہو گئی۔ بچاتا ہوں تو یہودی مذہب کی برکت اور نجات سے محروم رہی جاتی ہے اور نہیں بچاتا تو جنگل کی سوکھی ہوئی لکڑی کی طرح بھاڑ میں جھونک دی جاتی ہے۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔

بروُس : عورا۔ دنیا کے کسی باپ کے کلیج میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اپنی اولاد کی دردناک موت اپنی آنکھ سے دیکھ سکے۔ عقل سے پھر صلاح لے۔ تو دو حرف دے کر اس کی زندگی مجھ سے مول لے سکتا ہے۔

بروُس : جب اسے تبدیل مذہب سے انکار ہے، تو دیر بے کار ہے۔ ڈال دو کڑھاؤ میں۔

عورا : بروُس۔ اس پر حرم کر۔

بروُس : نہیں

عورا : اسے چھوڑ دے۔

بروُس : ہرگز نہیں۔

عورا : اس کی زندگی بھیک میں دے دے۔

بروُس : کبھی نہیں۔ اگر اپنی اور اس کی زندگی کا پیار ہو تو وہ سوال جس کو میں دھراتے دھراتے تھک گیا ہوں اس کا جواب دینے کو تیار ہو۔

عبرا : اچھا بتاتا ہوں۔

بروُس : بتاتا ہوں؟

عبرا : ہاں۔

بروُس : توبول

عبرا : ایک شرط سے۔

بروُس : بیان کر

عبرا : ان کو تاکید کر دے کہ جس وقت میں تیری لڑکی کا حال بیان کر چکوں تو پس و پیش کے خیال کو دل سے نکال دیں اور بغیر دوسرا حکم پائے اس لڑکی کو اٹھا کر تیل کے کڑھاؤ میں ڈال دیں۔

بروُس : میں اس شرط کو منظور کرتا ہوں۔

عبرا : دل و جان سے؟

بروُس : دین و ایمان سے۔

عبرا : اچھا تو سنو۔ شہر و مارکے جلنے سے دو برس پہلے کا واقعہ ہے کہ تو نے محض سلام نہ کرنے کے جرم میں میری پانچ برس کی پچی کو اس کی گود سے زبردستی چھین کر شیروں کے پنج بھرے میں ڈال دیا تھا۔ مگر اب ایک یہودی کا سلوک دیکھ کر کہ اس وقت جب کہ ظالم نیروں کے حکم سے تمام شہر میں آگ لگی ہوئی تھی میں نے تیرے جلتے ہوئے محل میں گھس کر تیری چچ ماہ کی اکلوتی پچی کو موت کے منہ سے باہر نکالا اور انتقام اور کینہ کو جس سے میرا سینہ جعل رہا تھا، بھول گیا اور اسے اپنی اولاد کی طرح پالا۔

بروُس : تو نے نکالا؟ تو نے پالا؟

عبرا : ہاں میں نے۔ میں نے ظالم رومان۔ ایک یہودی نے اور اس یہودی نے جسے تم ٹھوکریں مارتے تھے۔ جسے کتنا سمجھ کر دھنکارتے تھے۔

روئی جو اس کے حال پر، اس چشم نم کو دیکھ

اپنے ستم کو دیکھ، ہمارے کرم کو دیکھ

بروُس : مگر وہ کہاں ہے؟

عبرا : کیا جن آنکھوں سے خدا کی ہزاروں قتوں کو دیکھ کر بھی اُسے شناخت نہیں کر سکتے، ان آنکھوں سے اپنی لڑکی کو بھی

نہیں پہچان سکتے؟ دیکھو۔ غور سے دیکھو۔ خون آپ سے آپ جوش مارے گا۔ اگر تمہارا ہی ابو ہوگا تو رگوں کے اندر سے پکارے گا۔

**بروُس :** نہیں عزرا نہیں۔ تو مجھ سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ تیر و توار سے نہیں مار سکتا، اس لیے جھوٹی خوشی دلا کر دیوانہ بنا دیتا چاہتا ہے۔

**عورا :** وہ دیکھ۔ تیرے سامنے ہڈی اور خون سے بنا ہوا ایک آئینہ کھڑا ہے۔ اُسی آئینے میں تجھے، تیری کھوئی ہوئی لڑکی کی صورت نظر آئے گی۔ جو تیرے کلیچ کو ٹھنڈک پہنچائے گی۔

**بروُس :** یہ تو ایک یہودن لڑکی ہے۔

**عورا :** یہودن نہیں، رہمن نژاد ہے۔ میری نہیں تیری اولاد ہے۔

**بروُس :** میری؟

**عورا :** ہاں تیری۔ بیہی وہ لڑکی ہے جسے میں نے بھڑکتی ہوئی آگ سے باہر کالا اور اپنی اولاد بنا کر حتا کے نام سے پالا۔

**بروُس :** اس کا ثبوت؟

**عورا :** تیرے خاندان کی یادگار یہ تعویذ و عقیق کی مالا۔

خدا کی دین سے ملتا ہے یہ نصیبوں سے  
ہے رحم سیکھنا تو سیکھ ہم غریبوں سے

**بروُس :** ٹھیک یہ وہی مala ہے جو پیدائش کے روز نظر بد سے محفوظ رکھنے کے لیے میں نے لڑکی کے گلے میں پہنانی تھی۔  
پہچان لیا۔ وہی۔ وہی... آ... میرے دل کا سرور... میری آنکھوں کا نور... آ۔

**حَتَّا :** اب اجان۔

**عورا :** ٹھہر و۔ میرا وعدہ پورا ہو چکا۔ اب تمہارا وعدہ پورا ہونے کا وقت آیا۔ چلو۔ فکر و حیرت کو دل سے نکال دو اور باپ کے سامنے بیٹی کو اٹھا کر تیل کے کڑھاؤ میں ڈال دو۔

**بروُس :** نہیں عزرا۔ اب یہ نہیں ہو سکتا۔

**عورا :** نہیں ہو سکتا۔ کیوں نہیں ہو سکتا؟

حیرت اور خوف کی تصویریں بن کر حرکت کرنا کیوں بھول گئے؟ ثابت کرو کہ تم زندہ ہو۔

**بروُس :** نہیں عزرا نہیں۔ میری غرور کی زندگی ختم ہو گئی۔ میرے اقتدار کا سر بند قلعہ ایک ہی زنر لے میں ریزہ ریزہ ہو کر اپنی

خاک میں کفن پوش ہو گیا۔

جب پڑی خود اپنے سر پر ضرب، عبرت ہو گئی  
غیر کا بھی دکھ ہے دکھ، مجھ کو نصیحت ہو گئی

## تیسرا ایکٹ — تیسرا سین

در بار

(سب کا خوشی میں بیٹھے ہوئے دکھائی دیتا)

برؤس : میرے محسن عورا۔ میرے عزیز بھائی۔ اگرچہ محبت پدری کا کچھ اور ہی ارادہ ہے۔ گھر خاتا پر مجھ سے تمہارا حق زیادہ ہے۔ اس لیے جس دین و نمہب میں اس نے پروش پائی ہے اسی دین و نمہب میں رہے گی۔ جس طرح آج تک تمھیں اپنا باپ کہتی رہی ہے۔ اُسی طرح ہمیشہ کہے گی۔

مارگس : بیماری خاتا۔ میں تمہارا گنہ گار ہوں۔ اور جو سزا تجویز کرو اس کو بخوبی برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔



- حنا : میں تمہیں بھی سزا دیتی ہوں کہ جس طرح مجھے دھوکا دیا ہے، اسی طرح آئندہ کسی عورت کو دھوکا نہ دینا۔
- آکٹیویا : پیاری بہن۔ جب تم رومن نسل اور رومن باپ کی اولاد ہو تو تمہارا بادشاہ تمہارے لیے شادی کے قانون میں ضرور ترمیم کر دے گا۔
- بادشاہ : ایسا ہی ہو گا۔
- آکٹیویا : اس لیے میں چاہتی ہوں کہ اب جو دور تھا وہ قریب ہو۔ میری خوشی اور راحت میں تم برابر کی شریک ہو۔
- حنا : بس اب میں راحت، خوشی، آرام، اس جھوٹی دنیا کی کوئی چیز نہیں چاہتی.... تم دونوں جیواور خوش رہو۔
- آکٹیویا : تو بہن۔ تم اس جھوٹی دنیا میں تھہارہ کر کیونکر زندگی بسر کرو گی؟
- حنا : میں.....

(حنا کا گانا)

اپنے مولا کی میں جو گن بنوں گی  
 جو گن بنوں گی، برو گن بنوں گی  
 اپنے مولا.....

(پرده)

(آغا حشر کاشمیری)

## مشق

### سوالات

1. ڈرامے کی تعریف اور جزوئے ترکیبی کی وضاحت کیجیے۔
2. آغا حشر کاشمیری کی ڈرامائگاری کے امتیازات پر روشنی ڈالیے۔
3. ڈرامائیہودی کی لڑکی کے اہم کرداروں پر تبصرہ کیجیے۔

# چے خف

1860 تا 1904



آنتوں پالووچ چے خف شہلی کوہ قاف کی سرحدوں کے نزدیک روس کی ایک نبٹا گم نام بندگاہ ہنگان روگ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق جنوبی روس کے ایک تاتاری خاندان سے تھا۔ اسکول کی تعلیم پوری کرنے کے بعد 1879 میں چے خف ماسکو چلے گئے، یہاں انھیں ایک میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔

خاندان کی مالی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے چے خف نے افسانہ نویسی کی مشق شروع کر دی۔ شہر کے معمولی اخباروں اور رسالوں میں ان کے مزاحیہ افسانے شائع ہونے لگے۔ اس سے چے خف کو کسی قدر معقول آدمی بھی ہونے لگی۔ اس لیے تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے ڈاکٹری کے بجائے افسانہ نویسی کو ہی اپنا ذریعہ معاش بنالیا۔

1886 میں ان کا تعارف ایک مشہور نقاد گریگورو ویچ اور ماسکو کے سب سے بڑے اخبار کے ایڈیٹر سووورن سے ہو گیا۔ ان دونوں کی سرپرستی کی بدلت، روس کی ادبی دنیا میں چے خف کو ایک خاص حیثیت حاصل ہو گئی۔ جب سووورن کے اخبار میں ان کے افسانے شائع ہونے لگے تو انھوں نے مزاحیہ افسانے لکھنا ترک کر دیا۔ اب ان کے افسانوں میں وہ خاص تحریر آمیز رنگ پیدا ہو گیا تھا جو ان کی انتہائی صفت ہے۔

1890 میں مشرقی سائیپیریا جا کر انھوں نے سزا یافتہ مجرموں کی حالت کا معائنہ کیا۔ 1891 میں انھوں نے بڑی جانشناختی کے ساتھ، قط زدہ لوگوں کی خدمت انجام دی۔

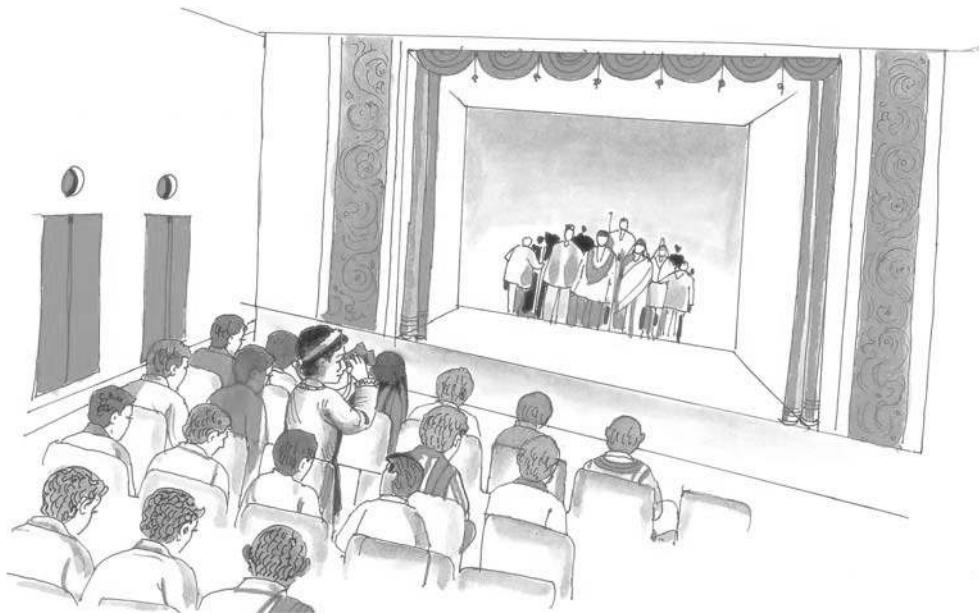
چے خف کو جوانی میں ہی دُق کی بیماری لاحق ہو گئی تھی۔ دھیرے دھیرے ان کا مرض زور پکڑتا گیا۔ آخر میں یہی بیماری ان کی موت کا باعث بنتی۔

چے خف افسانہ نویسی میں ایک نئے اور نازلے طرز کے موجوداً نے جاتے ہیں۔ عام طور سے ان کا ملنا جلتا متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں سے تھا۔ ان کے افسانوں میں زیادہ تر انھیں کی زندگی کے نقشے کھینچے گئے ہیں۔ کہانی کو معنی خیز بنانے کے لیے وہ

غیر معمولی حادثوں کا سہارا نہیں ڈھونڈتے۔ ان کے افسانے سیدھی سادی حقیقت کی بہ دولت لطیف اور دلکش ہو جاتے ہیں۔ پچھے خف کی زندگی ہی میں ان کے اکثر افسانوں اور ڈراموں کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ اردو زبان میں بھی پچھے خف کے بہت سے افسانوں اور ڈراموں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ پچھے خف کا شمار افسانے کی صنف کے سب سے ممتاز نمائندوں میں کیا جاتا ہے۔ اس نے اس فن میں عالم گیر شہرت حاصل کی ہے۔ مشرق و مغرب کی زبانوں کے کئی ادیب پچھے خف کے اسلوب کی تقاضہ کرتے ہیں اور پچھے خف کے افسانوں سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔

## کلرک کی موت

وہ رات بہت اچھی تھی، جب ایوان دسترچ چیر دیا کوف جو پیشے سے ایک کلرک تھا، تھیڑ کی دوسری قطار میں بیٹھا دوربین کی مدد سے ”لے کلوش دے کارنویل“ نام کے کھیل سے لطف اندوز ہورتا تھا۔ وہ اسٹچ کی طرف دیکھ رہا تھا، اور اپنے آپ کو انتہائی خوش نصیب انسان سمجھ رہا تھا کہ دفعتاً اس کا چہرہ متغیر ہوا، دیدے اوپر کی طرف چڑھ گئے، سانس ٹک گیا..... وہ دوربین سے منه ہٹا کر اپنی نشست پر دوہرा ہو گیا اور..... آخر چھیں!!! یعنی اسے چھینک آئی ..... اب یہ تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کو حق ہے کہ جہاں بھی چاہے چھینکے ..... کسان، پولیس انسپکٹر یہاں تک کہ بڑے بڑے سرکاری افسر بھی چھینکتے ہیں ..... ہر شخص چھینلتا ہے ..... ہر شخص ..... چیر دیا کوف کو ذرا بھی گھبراہٹ نہ ہوئی، اس نے جیب سے رومال نکال کر ناک پوچھی اور ایک صاحب اخلاق کی طرح اپنے چاروں طرف مزکر دیکھا کہ میری چھینک کسی کے لیے خلل انداز تو نہیں ہوئی؟ اور تباہ سے واقعی الجھن محسوس ہوئی، کیونکہ اس نے دیکھا



کہ پہلی قطار میں بالکل اس کے سامنے بیٹھا ہوا ایک پستہ قامت بوڑھا شخص بڑی اختیاط سے اپنی لگنگی چاند اور گردن کو اپنے دستانے سے صاف کر رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ بڑا تباہ جارہا ہے..... چیرو یا کوف نے پہچان لیا کہ یہ بوڑھا شخص وزارت رسائل و سائل کا سول جزل بری ٹالوف ہے۔

چیرو یا کوف نے سوچا۔ ”یہ درست کہ یہ میرا افسرنیں لیکن پھر بھی بر الگتا ہے، مجھے معافی مانگ لینی چاہیے.....“

”مجھے معاف کر دیجیے۔ میں..... یہ پہلے سے سمجھی بوجھی چیز نہیں تھی!“

”مہربانی کر کے آپ خاموش ہو جائیں تو اچھا ہے، مجھے سننے دیجیے!“

چیرو یا کوف کچھ بوکھلا گیا۔ ندامت آمیر انداز میں مسکرا یا۔ اور اسٹیچ کی طرف توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ ایکٹروں کو دیکھتا رہا، لیکن اب اپنے کو خوش نصیب انسان محسوس نہ کر سکتا تھا۔ پریشانی اسے کھائے جا رہی تھی۔ انٹرویل میں وہ بری ٹالوف کے نزدیک پہنچا۔ ..... کچھ دریتک پچکچا تارہ اور آخر چھبھک پر قابو پا کر سرگوشی کے انداز میں بولا:

”جناب عالی! میں نے آپ پر چینیک دیا..... معاف کیجیے..... آپ جانتے ہیں..... میرا مطلب یہ نہیں تھا.....“

”اچھا..... میں تو اسے بھول بھی گیا تھا..... اسے دہرانا ضروری ہے کیا؟“ جزل بولا۔ اس کا نچلا ہونٹ بے صبری سے

پھٹک رہا تھا۔

”کہتا ہے، میں بھول بھی گیا تھا۔ لیکن اس کی نظروں کا انداز مجھے پہنچنیں،“ بے چینی کے عالم میں جزل کی طرف دیکھتے ہوئے چیرو یا کوف نے سوچا۔ ”مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتا، اسے سمجھنا چاہیے کہ میرا منشائیں تھا..... یہ تو فطرت کا قانون ہے، ورنہ وہ سمجھے گا کہ میں اس پر تھوکنا چاہتا تھا، اگر ابھی ایسا نہیں بھی سوچا تو بعد میں سوچ سکتا ہے!.....“

گھر پہنچ کر چیرو یا کوف نے اپنی بیوی سے اپنی غیر شریفانہ حرکت کا ذکر کیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی بیوی نے پورے قتنے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ یہ صحیح ہے کہ تھوڑی دری کے لیے وہ چونک گئی تھی۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ بری ٹالوف ”ہمارا“ افسرنیں ہے تو اسے اطمینان ہو گیا۔

”لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ تم جا کر معافی مانگ لو، وہ بولی۔“ ورنہ وہ سمجھے گا کہ تمھیں کسی محفل میں بیٹھنے کا سلیقہ نہیں ہے۔“

”یہی تو بات ہے! میں نے مذعرت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا روایہ عجیب تھا۔ ایک بات بھی عقل کی نہیں کی۔“

اس کے علاوہ بات کرنے کا وقت بھی نہیں تھا۔“

دوسرے دن چیرویاکوف نے اپنی نئی وردی پہنی، بال کٹوائے اور بری ٹالوف کے پاس اس واقعے کو سمجھانے کے لیے چل دیا۔..... جزل کا ملاقاً تیوں کا کمرہ درخواست گزاروں سے بھرا ہوا تھا۔ خود جزل وہیں موجود تھا۔ اور درخواستیں لے رہا تھا۔ چند لوگوں سے ملاقات کے بعد جزل نے چیرویاکوف کے چہرے پر نظر ڈالی۔

”حضور کو یاد ہو گا کہ کل رات ”ارکیدیا“ میں.....“ کلر ک نے کہنا شروع کیا۔ ”میں نے ..... ار ..... چھینک دیا تھا اور ار ..... ایسا ہوا کہ ..... میری درخواست ہے .....“

”ہش! یہ کیا بکواس ہے!“ جزل بولا۔ ”تمھیں کیا چاہیے؟“ اس نے دوسرے شخص سے مناطب ہو کر پوچھا۔

”میری بات بھی نہیں سنے گا!“ چیرویاکوف نے سوچا اور اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ”اس کے معنی یہ ہیں کہ غصے میں ہے ..... ایسے وقت تو میں چھوڑ نہیں سکتا ..... اسے سمجھانا ہی پڑے گا.....“

آخری درخواست لینے کے بعد جب جزل اپنے نجی کمرے میں جانے کے لیے مڑا تو چیرویاکوف بُد بُد اتنا اس کے پیچھے چلا۔

”معاف کیجیے، حضور! انتہائی شرم دنگی کے احساس کی وجہ سے مجھے حضور کو تکلیف دینے کی بہت پڑھی ہے .....“

جزل نے اس طرح دیکھا کہ بُس چیخنے والا ہے اور اسے چلے جانے کا اشارہ کیا۔

”آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں جناب!“ وہ بولا اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

”مذاق!“ چیرویاکوف نے سوچا۔ اس میں مذاق کی توکوئی بات مجھے نظر نہیں آتی۔ اس کی عقل میں نہیں سماتی اور جزل بنا ہے۔ اچھی بات ہے۔ اب میں ان حضرت کو اپنی مذہر سے پریشان نہ کروں گا۔ اب دوبارہ نہیں جاؤں گا۔ اُسے صرف خط کھو دوں گا! لس اب بالکل نہیں جاؤں گا!“

گھر جاتے ہوئے چیرویاکوف یہی کچھ سوچتا رہا، لیکن اس نے خط نہیں لکھا۔ بہت سوچا لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ لکھے کیا۔ اس لیے دوسرے دن اسے پھر جزل کے یہاں جانا پڑا تاکہ معاملہ رفع دفع ہو جائے۔

”کل میں نے حضور کو زحمت دینے کی جرأت کی تھی،“ جزل نے اس کی طرف سوالیہ لگا ہوں سے دیکھا، چیرویاکوف نے اس پر کوئی دھیان دیے بغیر کہنا شروع کر دیا：“ اس لیے نہیں کہ میں آپ کا مذاق اڑانا چاہتا تھا، جیسا کہ حضور نے فرمایا تھا۔ میں تو مذہر سے کیا تھا، کہ میں نے چھینک کر آپ کو تکلیف پہنچائی ..... اور جہاں تک آپ کا مذاق اڑانے کا سوال ہے تو ایسی بات تو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ میری بہت کیسے پڑھتی ہے! اگر ہم نے لوگوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیا تو پھر کوئی عزت ہی باقی نہ رہ جائے گی ..... اپنے سے بڑوں کی عزت ہی نہ رہ جائے گی .....“

”نکل جاؤ بیہاں سے!“ جزل چینا۔ غصے کی وجہ سے وہ کانپ رہا تھا اور نیلا پڑ گیا تھا۔

”جی۔ کیا؟“ چرودیا کوف جو خوف سے سہم گیا تھا، ہکلنے لگا۔

”نکل جاؤ!“ جزل نے پاؤں پلتے ہوئے دہرا دیا۔

چرودیا کوف کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہو۔ وہ دروازے کی طرف مڑا تو اسے نہ کچھ سنائی دے رہا تھا، نہ کچھ نظر آرہا تھا۔ سڑک پر پہنچا اور چلتا گیا۔ لڑکھڑا تا ہوا وہ بالکل بے جس ہو گیا، اپنے گھر پہنچا۔ اور اپنی سرکاری وردی پہنچ پہنچ جس حلیے میں تھا، اسی میں صوفے پر لیٹ گیا اور..... مر گیا۔

(پے خف)

(روسی سے ترجمہ: ظ۔ انصاری)

## مشق

### سوالات

1. چرودیا کوف کو ایک صاحبِ اخلاق انسان کیوں کہا گیا ہے؟

2. دفعتاً چھینک آنے پر چرودیا کوف کا رِ عمل کیا تھا؟

3. آپ کے نزدیک جزل بری ڈالوں کے کردار کا کون سا پہلو ناپسندیدہ ہے؟

4. چرودیا کوف کی موت کا سبب کیا ہے؟

# ویکوم محمد بشیر

1910 تا 1994

ویکوم محمد بشیر کی ولادت کیرالا میں ہوئی۔ ان کے والد عمارتی لکھری کے ٹھیکے دار تھے۔ کاروبار میں بڑے نقصان سے دوچار ہونے کی وجہ سے ان کا گھر ان غربی اور نگریتی کا شکار ہو گیا۔

محمد بشیر بچپن ہی سے بڑے ذہین اور ملنسار انسان تھے۔ نہایت حساس طبیعت رکھتے تھے۔ وہ گیارہ برس کی عمر میں وہ آزادی کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس کی وجہ سے انھیں اسکول چھوڑنا پڑا۔ رفتہ رفتہ ان کی سیاسی اور انقلابی سرگرمیاں اتنی بڑھ گئیں کہ ان کی وجہ سے انھیں کیرالا بھی چھوڑنا پڑا۔ وہ بے سروسامانی کے عالم میں ملک کے مختلف حصوں میں گھومتے پھرے اور طرح طرح کے لوگوں سے ملتے جلتے رہے۔ یہ دور تجربات کے خاطر سے ان کی زندگی میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انھیں رفتہ رفتہ یقین ہوتا گیا کہ زندگی اپنی رنگارکی کے باوجود دنیا میں ہر جگہ ایک جیسی ہوتی ہے۔ ہر فرد اپنی پیدائش اور موت کے درمیانی وقفعے کو کسی طور کردار دینے کی جدوجہد میں مصروف رہتا ہے۔

محمد بشیر نے 1937 کے آس پاس لکھنا شروع کیا۔ اس وقت ان کی عمر 27 سال تھی۔ وہ زندگی کا جو وسیع اور رنگارنگ تجربہ حاصل کر چکے تھے، اس سے بہت کم لوگ گزرتے ہیں۔ دراصل یہی تجربات بشیر کی زندگی کے قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ویکوم محمد بشیر کی پہلی اہم تخلیق ”بچپن کی ساختی“ (مطبوعہ 1944) ہے جسے انھوں نے اپنی کتاب زندگی کا ایک ورق قرار دیا۔ اس کہانی نے ملیالم کے افسانوی ادب کوئی راہ دکھائی۔ محمد بشیر کی کہانیاں زندگی کی حقیقتوں سے لبریز ہوتی ہیں۔ انھوں نے جو کچھ لکھا، اس کی بنیاد اس کے حقیقی تجربے تھے۔ وہ اپنی بات نہایت سادہ، سلیمانی اور عام فہم انداز میں لکھنے پر قادر تھے۔ ملیالم ناول اور افسانے کی زبان پر ان کی تخلیقات کے گھرے اثرات ہیں۔ اس کا اعتراف کئی نقادوں نے کیا ہے۔

ویکوم محمد بشیر کو ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر کئی انعامات اور اعزازات سے نوازا گیا۔ 1970 میں ساہیہ اکادمی کی

فیلوشپ مل۔ 1982 میں حکومت ہند نے ”پدم شری“ کا خطاب دیا اور 1987 میں کالی کٹ یونیورسٹی نے اپنے اس عظیم فنکار کو جو رسی تعلیم حاصل نہ کر سکا تھا، ڈاکٹر آف ییٹرز کی اعزازی سند عطا کی۔

محمد بشیر نے انتقال سے پہلے اپنا آخری مضمون ان الفاظ پر ختم کیا تھا: ”میں اپنے سفر کے خاتمے پر پہنچ رہا ہوں۔ کون جانے شاید یہ کسی دوسرے سفر کا آغاز ہو۔ وقت صرف خدا کے خزانے میں ہے، وہی میری راہ متعین کرے گا۔ میں دنیا کی خوش حالی کی تمنا کرتا ہوں اور ہر فرد و بشر کی مسرت اور اس کے سکون وطمینان کی دعا کرتا ہوں۔“

## جنم دن

مکرام کی آٹھویں تاریخ ہے، آج میرا جنم دن ہے۔ میں اپنے معمول کے خلاف صبح سوریے ہی اٹھ گیا۔ نہاد ہو کر کھدرا کی تمیض، دھوتی اور سفید کیوس کے جوتے پہنے اور آرام کری پر تکیہ لگا کر مجھے ہوئے دل سے دراز ہو گیا۔ میرا پڑوتی میتھی جوبی۔ اے۔ کا طالب علم تھا، مجھے اتنے سوریے بیدار دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اس نے مسکرا کر مجھے سلام کیا۔

”ہیلو! گڈمارنگ“ اس نے انگریزی میں کہا۔

”جی!“ میں نے جواب دیا۔ ”گڈمارنگ۔“



اس نے پوچھا۔ ”آج آپ اتنی جلدی کیسے اٹھ گئے.....کیا کہیں جانا ہے؟“

”نہیں“ میں نے بتایا : ”آج میرا جنم دن ہے۔“

”آپ کا بڑھ ڈئے“ اس نے انگریزی میں پوچھا؟

”جی ہاں“

”خوشی کا یہ دن تمہاری زندگی میں بار بار آئے۔“

”شکریہ“

میتھیو اپنے دانتوں میں برش دبائے ہوئے غسل خانے میں داخل ہوا۔ چاروں طرف سے شور و غل کی آوازیں آرہی تھیں۔

ان ملی جملی آوازوں میں پیار کے نغمے بھی شامل تھے۔ وہ لوگ طالب علم اور کلرک تھے۔ ”کیا ان میں سے کسی کو کوئی پریشانی تھی؟“

ان کے لیے زندگی تو بہت خوشنگوار تھی، لیکن میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ایک کپ چائے کس طرح مل سکے گی۔ دوپہر کا کھانا یقینی تھا۔ کل

جب میں بازار جا رہا تھا تو حامد نے مجھے بغیر کسی وجہ کے دوپہر کے کھانے کی دعوت دے دی۔ وہ ایک معنوی ساشا علیکن امیر آدمی

ہے، لیکن میں لمحے کے وقت تک بغیر چائے کے نہیں رہ سکتا تھا۔ کمرے میں بیٹھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ میتھیو کا بوڑھا نوکر اس کے

لیے چائے بنانے میں مصروف ہے۔ میرا کمرہ میتھیو کے باور پھی خانے کا اسٹور بنا ہوا تھا۔ مالک مکان نے آٹھ آنے ماہوar پر مجھے

کراچیے پر دیا تھا۔ یہ پوری عمارت میں سب سے چھوٹا کمرہ ہے۔ میری آرام کری، میز، الماری اور پینگ کے بعد مشکل سے سانس

لینے کو جگد بچتی ہے۔ احاطہ کی دیوار سے گھری تین عمارتوں کے تمام کروں میں طالب علم اور کلرک رہتے ہیں۔ میں واحد آدمی ہوں

جسے مالک مکان پسند نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں پابندی سے کرایہ ادا نہیں کرتا۔

آج میرا جنم دن ہے۔ میں اپنے گھر سے دور ہوں۔ میرے پاس پیسے بھی نہیں اور قرض لینے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں۔ جو

کپڑے پہنے ہوئے ہوں، وہ خود میرے دوستوں کے ہیں۔ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جسے اپنا کہہ سکوں۔ میتھیو نے جب مجھے جنم دن پر

بہت سی نیک خواہشات پیش کیں تو میرا دل غریب ہو گیا۔

سات بجے: مجھے یاد آ رہا ہے۔ آرام کری پر بیٹھے ہوئے میں نے سوچا: کم سے کم اس روز مجھے کسی غلط کام سے بچنا چاہیے۔

آج کے دن مجھے کسی سے قرض نہیں لینا چاہیے اور آج کوئی غلط بات نہیں ہونی چاہیے۔ آج کے ”میں“ کو میرے ان سینکڑوں رنگ

بدلتے چھروں سے بالکل مختلف ہونا چاہیے جو ماضی کے سفید و سیاہ شب و روز میں نظر آ رہے ہیں۔ آج میری عمر کتنی ہو گئی؟ پچھلے سال

کے مقابلے میں ایک برس اور بڑا ہو گیا ہوں..... پچھلے سال..... چھمیں (26) نہیں بتیں (32) یا سینتالیس (47)؟

میرا ذہن بے حد پریشان تھا۔ میں نے اٹھ کر آئینے میں دیکھا: میں اتنا بڑا تو نہیں ہوں۔ ایک خاصاً منفرد چہرہ، اوپرچی اور کشادہ پیشانی، ٹھہری ٹھہری آنکھیں، ایک نمیدہ توارکی طرح باریک موچیں۔ بھیت جمیعی برائیں تھا۔ اس سوچ کے دوران مجھے ایک ایسی چیز نظر آئی جس سے مجھے دھکا لگا۔ میرے کان کے اوپر کالے بالوں کے درمیان سفید کیرسی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے کوشش کر کے اسے کھینچ کر نکال دیا۔ پھر میں اپنے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ پشت پر سے میرا سرخا صاہمور تھا۔ سر پر ہاتھ پھیرنے کے دوران مجھے سر میں ہلاکا سادر محسوس ہوا۔ ممکن ہے کہ چائے نہ پینے کی وجہ سے ہو۔

نوبجے: ہوٹل کے مالک نے دور سے دیکھ لیا اور وہ چہرہ بسورتا ہوا اندر واپس چلا گیا۔ ہوٹل کا میلا کچیلا چھوکرا جس نے چائے بنائی تھی، نقد پیسے مانگنے لگا۔

میں نے کہا: ”ارے بھائی، پیسے کل دے دوں گا۔“

اسے مجھ پر اعتبار نہیں تھا: ”آپ نے کل بھی یہی کہا تھا۔“

اس نے پلٹ کر جواب دیا۔

”مجھے خیال تھا کہ مجھے آج کچھ پیسے مل جائیں گے۔“

”مجھے حکم ہے کہ جب تک پہلے کے پیسے نہ دے دیں آپ کو چائے نہیں دی جائے۔“  
”اوہ“

دیس بیجے: میرے ہونٹ سوکھ گئے۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ دو پھر کی سخت گرمی کی وجہ سے میرا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ اسی لمحے آٹھ دس سال کی عمر کے پتلے دبلے زرد چہرے والے دو عیسائی لڑکے لکڑی کی کھڑاؤں بیچتے ہوئے میرے دروازے پر آئے۔ انھوں نے آواز لگائی: تین آنے جوڑا۔

”لڑکو! مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔“

”لیکن، اگر آپ جیسے لوگ ہیں خریدیں گے تو پھر کون خریدے گا؟“

”لڑکو! مجھے ضرورت نہیں ہے..... میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“

”اوہ“

ان کے چہروں پر بے اعتباری تھی۔ وہ اتنے معصوم تھے کہ ظاہر کے پیچھے حقیقت کو نہیں سمجھ پائے۔ میرے کپڑوں، میری آرام کرتی کو دیکھ کر مجھے سر کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے لیکن آرام کری، تمیش، دھوتی، جوتے ..... ان میں سے کچھ بھی میرا نہیں ہے۔

میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میرا بدن بھی کیا میرا اپنا ہے؟ ہندوستان کا ہر شہر میں نے گھوما ہے اور کتنی الگ الگ جگہوں پر الگ الگ طرح سے رہتا ہوں۔ میرا خون، میرا گوشٹ پوست اور میری بدھیاں تک ہندوستانی ہیں۔ کنیا کماری سے کشمیر تک، کراچی سے گلگتہ تک۔ دراصل ہندوستان کے تقریباً ہر حصے میں میرے دوست موجود ہیں۔ مرد، عورت، میرے سبھی دوست ایک ایک کر کے میرے ذہن میں آ رہے ہیں۔ پورے چاند کی چاندنی کی طرح معطر میری محبت پورے ہندوستان میں پھیل جائے۔ میری یہ خواہش ہے، لیکن مجھے جانے والا ممحص سے محبت کرنے والا کون ہے؟ میں سب کچھ ہوں لیکن واقعتاً میں کیا ہوں؟ ’آ‘ مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے! درد سے میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ کیونکہ میں نے چائے نہیں پی تھی؟ درد کی وجہ سے سر اٹھانے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ بہتر ہے کہ میں جا کر کھانا کھاؤں۔ اسی سر درد کی حالت میں مجھے ایک میل کی مسافت طے کرنا ہے لیکن کم سے کم بھر پیٹ کھانا تو مل جائے گا۔

**گیارہ بج:** حامد دکان پر نہیں تھا۔ کیا وہ گھر چلا گیا؟

زیادہ مناسب ہو گا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلتا۔ ممکن ہے وہ بھول گیا ہو۔ میں اس کے گھر جاؤں تو؟

**سائز ہے گیارہ بج:** حامد کے د منزلہ گھر کے آہنی دروازے بند ہو چکے تھے۔ میں نے کھلکھالیا: ”مسڑ حامد“

ایک عورت نے جواب دیا: ”وہ نہیں ہیں۔“ وہ کہاں گئے ہیں؟ کوئی جواب نہیں۔ نگ آ کرو اپنے جانے سے پہلے میں نے

ایک بار پھر دروازے پر دستک دی۔

میں نے کسی کے قدموں کی آہٹ، چوڑیوں کی کھلکھناہٹ سنی۔ تھوڑا سا دروازہ گھلا۔ ایک جوان خاتون دکھائی دی۔

”میں نے اس سے پوچھا کہ حامد کہاں گئے ہیں۔“

”انھیں فوری طور پر کسی ضروری کام سے جانا پڑ گیا ہے۔“

”وہ کب واپس آئیں گے؟“

”شام کو دیر سے آئیں گے۔“

”شام کو دیر سے؟“

”جب وہ واپس آ جائیں تو مہربانی کر کے انھیں میرے آنے کے بارے میں بتا دینا۔“

”میں کیا نام بتاؤ؟“

”میں کون ہوں؟“

”میں ..... اوہ ..... کچھ نہیں، میں کیا بتاؤ؟ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ریت گرم خشک چینی کی طرح ہو رہی تھی۔ جھیل کا پانی شیشے کی طرح چک رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندر ہیرا چھا گیا۔ میں بہت پریشان تھا۔ میری ڈیاں جل رہی تھیں۔ بھوک اور پیاس۔ میں فاقہ سے تھا۔ مجھے اتنی بھوک لگ کر رہی تھی کہ اگر مٹی ملتی تو اس کو بھی کھالیتا۔ میری بھوک کی شدت اس احساس کی وجہ سے اور بڑھ گئی کہ میرے پاس کھانا حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ شب و روز کا ایک لامتناہی سلسلہ میرے سامنے تھا لیکن کھانا ملنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ میں نقاہت سے گراجاہ رہا تھا۔

سازھے گیارہ بجے: میرے شناسا میرے پاس سے اس طرح سے گزر گئے کہ جیسے انھوں نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔

”اے میرے دوستو! میرے جنم دن پر میرے لیے خوشی کی دعا میں کرو۔“

میں اپنے آپ سے سرگوشیوں میں کہہ رہا تھا۔ ان کے سامنے میرے قریب سے گزرتے گئے۔ ایسا کیوں ہوا کہ میرے دوستوں نے مجھے دیکھ کر مجھ سے بات تک نہیں کی؟

کیا یہ اس وجہ سے تو نہیں تھا کہ ایک سی۔ آئی۔ ڈی۔ کا آدمی میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔

ایک بجے: میں مسٹر ”پی“ کے پاس پہنچا جو پہلے ایک اخبار کے ایڈیٹر تھے اور اب ایک دکان کے مالک۔ مجھے بھوک کی شدت میں مشکل سے نظر آ رہا تھا۔ ”پی“ نے پوچھا کہ ”انقلاب“ آنے میں کتنی دیر ہے۔

”بہت جلد آنے والا ہے۔“

”اہ۔ہا۔ کیا کوئی خاص بات؟“

”اے کوئی بات نہیں، بس یوں ہی آگیا۔“

میں اس کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے بہت سے مضامین اس کے نام سے شائع ہو چکے تھے۔ اپنی شان دکھانے کی غرض سے اس نے بہت سے پرانے پرچوں کو بیکجا کر کے جلد بند ہوائی تھی۔ چکراتے ہوئے سر کے ساتھ اس کو دیکھنے لگا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اس سے آواز آ رہی تھی ”میں ایک کپ چائے پینا چاہتا ہوں اور بہت تھکا ہوں ہوں۔“ ”پی“ مجھ سے چائے کے لیے کیوں نہیں پوچھ رہا ہے؟ کیا اسے میری ہنکان نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ سمجھدی گی سے گلے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں گونگا بنا ہوا گلی کی طرف دیکھنے لگا۔ دو بھکاری لڑکے کوڑے کے ڈھیر میں پڑے ہوئے ایک ڈو سے کے ٹکڑے پر جھگڑ رہے تھے۔ میرے پورے وجود نے ایک خاموش انبجاش کی۔

”ایک کپ چائے“۔ ”پی“ نے اپنا بکس کھولا اور اس میں سے ایک آنہ نکال کر ایک لڑکے کو دے دیا۔

”چائے لاؤ“ اس نے کہا۔ میری کچھ ڈھارس بندھی۔ لڑکا چائے لینے کے لیے چلا گیا ”پی“ نے لڑکے کے لائے ہوئے چائے کا کپ لے کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کیا تم چائے پیو گے؟“

میں نے کہا ”نہیں“، اور میں اپنے جوتے کے فیتے باندھنے کے بہانے جھک گیا۔ ”پی“ نے شکایت کی۔ ”تم نے مجھے اپنی کوئی کتاب نہیں دی۔“

”میں ضرور دوں گا۔“

”میں ان پر تبصرے پڑھتا رہا ہوں۔“

”خوب!“ میں نے مسکرانے کی کوشش کی، لیکن جب دل بجھا ہوا ہو تو پھرے پر مسکراہٹ کیسے آسکتی ہے؟  
میں اٹھا اور سڑک پر چل دیا۔

سی۔ آئی۔ ڈی۔ کا آدمی میرا تعاقب کر رہا تھا۔

دوبجے: میں تھکا ماندہ اپنے کمرے میں آرام کرسی پر پڑا ہوا تھا۔ ایک اجنبی عورت جو عمدہ کپڑے پہنے ہوئے تھی، میرے دروازے پر آئی۔ وہ کسی دور دراز علاقت سے آئی تھی۔ اس کا شہر سیالا کی وجہ سے تباہ ہو گیا تھا۔

”بہن، میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ کہیں اور جاؤ۔“

”اوہ“ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ کو را جواب پا کر اٹھلاتی ہوئی چلی گئی۔ کیا مہک چھوڑ گئی۔

تین بجے: اگر میں کسی سے قرض لیتا ہوں تو اس میں کیا بات ہے؟ میری نقاہت انتہا کو پہنچ پکھی تھی، عجب بے بی کا عالم تھا۔  
میں کس کے پاس جاؤں؟ میرے ذہن میں بہت سے نام آرہے تھے لیکن کسی سے قرض لینا اپنی خودداری کو مجرور  
کرنا ہے..... کیا میں خود کشی کروں؟ موت کیسی ہوگی؟

سماڑھے تین بجے: میری زبان لڑکھڑا گئی۔ کاش میں اپنے آپ کسی سمندر کے ٹھٹھے پانی میں ڈوب سکتا! اسی حالت میں پڑا ہوا تھا کہ مجھے کچھ ایڈیٹروں کے خط ملے۔ ان کا مطالبہ واپسی ڈاک میں کہانیاں مانگنے کا تھا۔ خطوں کو ایک طرف چھینک کر میں بے بی سے پڑا رہا۔ بینک ٹکر کر شناپلے کا ملازم لڑکا ماجس مانگنے آیا۔ میں نے اس سے پانی کا ایک گلاس منگوا کر بیا۔

”مالک، کیا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟“ لڑکا جاننا چاہتا تھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

تو پھر..... ”کیا آپ نے کھانا نہیں کھایا ہے؟“

”نہیں“

”کیوں نہیں کھایا؟“

بچہ کا معموم چہرہ، کالی آنکھیں، کالے دھنے لگا ہوا کپڑا، جسے وہ پہنے ہوئے تھا۔ وہ جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے آہستہ سے پکارا ”مالک۔“

”ہوں“ میں نے اپنی آنکھیں کھول لیں۔

”میرے پاس دو آنے ہیں۔“

”تو“

اس نے جھینپتے ہوئے کہا۔

”اگلے مینے میرے گھر جانے سے پہلے آپ یہ پیسہ واپس دے دیں۔“

میں اس کی بات سے بہت متاثر ہوا۔

”لے آؤ“ میں نے کہا۔

میری بات پوری طرح سُنے بغیر ہی وہ چلا گیا۔

اسی وقت میرا دوست گنگا دھر آگیا۔ وہ سفید کھادی کی دھوتی اور سفید کھدر کا جبہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے کندھے پر نیلے رنگ کی شال پڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر سخیدگی طاری تھی۔ مجھے آرام کر سی پر بے تعلق ساپڑا دیکھ کر اس نیتا نے مجھ سے کہا:

”تم تو بڑے بورڈا ہو گئے ہو۔“ اگرچہ میرا سر پچکار ہاتھ پھر بھی میں نہیں پڑا۔ مجھے تجھب ہو رہا تھا کہ یہ نیتا جو کپڑے پہنے ہوئے ہے، کس کے ہیں! میری باطنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہرجانے والے قومی کارکن کی تصویر گزر رہی تھی۔

”تم کیوں نہ رہے ہو؟“ گنگا دھر نے پوچھا۔

”ارے، کچھ نہیں، بیٹھ، مجھے تمہارے حلیے کو دیکھ کر ہنسی آگئی۔“

”نداق بند کرو اور میری بات سنو۔ ایک بڑی پریشانی آپڑی ہے۔“ قریب تین ہزار مزدوروں نے ہڑتاں کر دی۔ وہ ڈیڑھ

بنٹے سے بھوکے مر رہے ہیں۔ یہ مصیبت بڑھ سکتی ہے۔“

”کیا بات ہے؟ اخباروں میں تو یہ خبر پڑھی نہیں۔“ ”اخباروں میں اس خبر کی اشاعت پر پابندی لگادی گئی ہے۔“

”یا چھی بات ہے۔“

”اس کے بارے میں مجھ سے کیا چاہتے ہو۔“ اس سلسلے میں ایک جلسہ ہو رہا ہے، میں اس کا صدر ہوں۔ وہاں کشتنی سے پہنچنے کے لیے ایک آنے کی ضرورت ہے۔ آج میں نے کچھ نہیں کھایا۔.....

”تم میرے ساتھ چلو۔“

”بیٹھی یہ بالکل صحیح ہے لیکن میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے۔ کئی روز سے میرے منھ میں کھپل تک نہیں گئی ہے۔ آج میرا جنم دن ہے۔ میں نے اب تک کچھ نہیں کھایا۔ پھر بھی دیکھتے ہیں، تھوڑا انتظار کرو۔“ پھر گگا دھر، مزدوروں، قومی کارکنوں اور گورنمنٹ کے بارے میں بولنے لگا۔ میں اخبار کے ایڈیٹریوں اور ادیبوں کے بارے میں ذکر کرتا رہا۔ اس دوران ملازم اڑکا واپس آیا۔ میں نے اس سے ایک آنے لیا اور چائے، بیڑی اور ڈوسا ڈغیرہ لانے کو کہا۔ وہ چائے اور چند بیڑیاں، ایک ڈوسا جو چھوٹا سا پڑا لگ رہا تھا، لے آیا۔ کسی امریکی اخبار کے گذرا جس میں ڈوسا لپٹا ہوا تھا۔ اس پر ایک تصویر چھپی ہوئی تھی، جو میری توجہ کا مرکز ہن گئی۔ میں اور گگا دھر ڈوسا کھانے لگے۔ ایک گلاس پانی پی کر چائے پی اور بیڑی جلائی اور ایک آنا گگا دھر کو دے دیا۔ چلتے وقت اس نے مذاقہ مجھ سے کہا۔ ”آج آپ کا جنم دن ہے نا۔ کیا آپ دنیا کے نام کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں۔“

”میں نے کہا، ”ہاں بیٹھا،“ انقلاب سے متعلق ایک پیغام!

”مجھے بتاؤ۔“

”ہر جگہ انقلاب کے شعلے بھڑکا دو۔ موجودہ سماجی نظام کو جلا کر راکھ کر دو اور ایک نئی دنیا پیدا کرو۔“

”بہت اچھا، یہ پیغام مزدوروں تک پہنچا دوں گا۔“

گگا دھر تیزی سے چلا گیا۔ میں متعدد قومی کارکنوں اور ادیبوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ سب لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیٹ کر سوچتے ہوئے میں نے اخبار کا وہ ٹکڑا اٹھایا جس میں ڈوسا لپٹا ہوا تھا۔ تب ہی میں نے دیکھا کہ مالک مکان غصے کے عالم میں دروازے سے میری طرف آیا۔ میں شش و نیٹھی میں تھا کہ اس سے کیا بہانہ کروں گا۔ اس لیے میں تصویر دیکھنے لگا۔ تصویر میں ایک ایسا شہر تھا جو فلک بوس عمارتوں سے بھرا پڑا تھا۔ ان عمارتوں کے درمیان ایک آدمی سر اٹھائے آہنی زنجیروں سے بندھا ہوا زمین پر کھڑا تھا لیکن وہ نہ تو زنجیروں کی طرف دیکھ رہا تھا اور نہ ہی زمین کی طرف۔ وہ بہت دورستاروں سے پرے لامدد خلامیں شعائیں بکھیرتے ہوئے روشنی کے ایک بڑے منبع کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیروں میں ایک گھٹی کتاب رکھی تھی۔ اس کے کھلے دو صفحات پر درحقیقت بنی نوع انسان کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ وہ تحریر اس طرح تھی۔ ”حالانکہ وہ زمین پر زنجیروں سے بندھا تھا لیکن

اس کی نظریں زمان و مکاں سے ماوراء مستقبل میں ہونے والی شاندار ترقی پر تھیں۔  
کہیے جناب، مالک مکان نے سردہری کے ساتھ کہا۔

”کیا آج آپ کرایہ ادا کر سکتے ہیں؟“

میں نے کہا، ”مجھے اب تک میرا پیسہ نہیں ملا ہے۔ چند روز میں ضرور ادا کر دوں گا۔“ ”ایسی زندگی کس کام کی؟“ اس نے پوچھا۔

یہ بات صحیح تھی۔ ایسی زندگی کس کام کی؟

تین سال پہلے میں اس عمارت میں آیا تھا۔ میں نے باورچی خانوں کی مرمت کرائی تھی۔ ان میں سے ہر ایک خاصے اچھے کرائے پڑھا ہوا ہے۔ اب میں نے پوچھا اسٹور روم بنادیا ہے۔ تب وہ مجھ سے یہ کہتا ہے کہ یہ زیادہ کرائے پڑھ سکتا ہے۔ اگر میں اس کا زیادہ کرایہ نہیں دے سکتا تو میں اس کو خالی کر دوں۔ میں اس کرے کو خالی نہیں کروں گا!

چار بجے: میں اس ملک سے اکتا گیا ہوں۔ اس شہر میں دچپی کی کوئی چیز نہیں ہے، مجھے یہاں وہی دکانیں، وہی سڑکیں اور وہی چہرے نظر آتے ہیں اور وہی باقی سننے میں آتی ہیں..... میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتا۔

چھ بجے: شام سہاپنی تھی۔ ڈوبتا سورج خون کے ایک ایسے گولے کی طرح لگ رہا تھا جسے سمندر نے نگل لیا ہو۔ آسمان کے مغرب میں سنبھرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سمندر بکراں نظر آرہا تھا۔ نزدیک ہی ہمیں مارتی ہوئی جھیل تھی۔ اس کا ساحل کتنا پُرسکون تھا۔ من چلے نوجوان سکریٹ پیٹے ہوئے پھل قدمی کر رہے تھے۔ نوجوان عورتیں شاندار سائزیاں پہنے ہوئے ڈزدیدہ نگاہوں اور شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ وہاں آرام کر رہی تھیں۔ دل نہمانے کے لیے عشقیہ فلموں کے گیت بھی سُنے جاسکتے تھے۔ فضا میں پھولوں کی بھینی مہک گھلی ہوئی تھی..... لیکن میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

سات بجے: ایک سپاہی گھر پر آیا اور مجھے دوبارہ اپنے ساتھ لے گیا۔ مجھے چکا چوند کر دینے والے پیٹرو میکس یمپ کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ جب میں پوس والوں کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا تو ڈپی کمشنزٹھنے ہوئے میرے چہرے کے تاثرات کا بڑی توجہ کے ساتھ مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی میرے چہرے سے نظر نہیں چڑائی۔ ان ناظروں میں کتنی حقارت تھی جیسے میں نے کوئی خوفناک جم کیا ہو۔ مجھ سے ایک گھنٹے تک پوچھتا چھ ہوتی رہی۔ کون کون میرے دوست ہیں؟ میرے پاس خط کہاں سے آتے ہیں۔ کیا میں کسی خفیہ تنظیم کا ممبر تو نہیں ہوں، جو حکومت کا تختہ الٹ دینا چاہتی ہے؟

”میں آج کل کون سی نئی چیز لکھ رہا ہوں؟“ مجھے صحیح صحیح پوری بات بتانا چاہیے۔

”تم جانتے ہو کہ میں تمہیں شہر بدر کر سکتا ہوں۔“

”میں جانتا ہوں کہ میں بالکل بے بس ہوں۔ اگر صرف ایک سپاہی چاہے تو گرفتار کر کے حوالات میں ڈال سکتا ہے۔“

سماڑھے سات بجے: میں اپنے کمرے میں واپس آگیا اور اندر ہیرے میں بینٹا پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ آج میرے کمرے میں روشنی بھی نہیں تھی۔ تھوڑا سا بھی متی کا تیل کہاں سے لاتا اور بھوک کو مٹانے کے لیے کچھ کھانا بھی ضروری تھا۔ مجھے کھانا کون دے گا؟ کسی سے قرض بھی نہیں لے سکتا۔ اگر میتھیو سے کہا جائے تو؟ نہیں، میں چشمہ لگانے والے اس طالب علم سے قرض کے طور پر ایک روپیہ لوں گا۔ وہ اگلی عمارت میں رہتا ہے۔ اس نے اپنی حالیہ بیاری کے دوران ان جگشنوں پر خاصی رقم خرچ کی تھی۔ آخر کار، وہ میری چار آنے والی دوا سے ٹھیک ہوا۔ اس کے بدلتے میں وہ مجھے ایک مرتبہ سینما دکھانے لے گیا تھا۔ اگر میں اس کے پاس جا کر ایک روپیہ مانگوں تو وہ انکار نہیں کر دے گا۔

آٹھ بجے کر پینٹا لیس منٹ: راستے میں میں نے میتھیو کے بارے میں معلوم کیا۔ وہ سینما دیکھنے لیا ہوا تھا۔ زور سے بولنے اور قہقہوں کی آواز سن کر میں دوسری عمارت کی بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ وہاں سے سکریٹ کے دھویں کی بو اور گیس کی لاثین کی روشنی آرہی تھی۔ میں بے لہی کا مجسمہ بنایا کر سی پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے اپنی بات چیت جاری رکھی۔ قومی معاملات، سینما، کالج کی لڑکیوں کی باتیں۔ ان لڑکیوں کا ذکر جو دن میں دوبار سماڑیاں بلتی ہیں اور اس طرح کی بہت سی باتیں۔ میں بھی ان کی باتوں میں شامل ہو کر اپنی رائے کا اظہار کرنے لگا۔

نوبجے: میں نے اپنا بستر بچھایا اور لیٹ گیا لیکن مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میرے سر میں درد ہو رہا تھا لیکن بستر پر پڑا رہا۔ مجھے دنیا کے بے بس غریب لوگوں کا خیال آیا۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں کروڑوں لوگ بھوکے پڑے ہوں گے۔ میں بھی ان کروڑوں لوگوں میں سے ایک تھا۔ مجھ میں کیا خاص بات ہے؟ میں بھی ایک غریب آدمی ہوں اور بس، جبکہ میں اس طرح سے لیٹا ہوا سوچ رہا تھا..... میرے منھ میں پانی بھر آیا۔

میتھیو کے باور پچی خانے سے سرسوں کے پرونسے کی آواز آرہی تھی..... اور اُبلے ہوئے چاولوں کی خوشبو بھی۔

سماڑھے نوبجے: میں کمرے سے باہر آیا۔ میرا دل اتنی تیری سے اچھل رہا تھا جیسے کہ وہ پھٹ جائے گا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو! میں پسینے میں شرابور تھا۔ صحن میں کچھ دری رکا۔ قسمت سے بوڑھا نوکر ایک برتن اور لیمپ لیے ہوئے تکلا۔ اس نے دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا چھوڑ دیا اور نئی کی طرف چلا گیا۔ کم از کم اُسے دس منٹ ضرور لگیں گے۔ میں نے دروازہ کھولا اور باور پچی خانے میں داخل ہو گیا۔

دس بجے: میں پسینے سے شرابور باور پی خانے سے نکلا تکن میرا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ جب بوڑھا آدمی واپس آ رہا تھا، میں تل کی طرف چلا گیا۔ تھوڑا پانی پیا اور ہاتھ، منہ، پاؤں دھوئے۔ کمرے میں پہنچ کر بیڑی سلاکائی اور کش لینے لگا۔ میں بالکل تھک چکا تھا۔ اس لیے لیٹ گیا۔ سونے سے پہلے مجھے یہ خیال آ رہا تھا، کہیں بوڑھے کو پتا تو نہیں چل گیا۔ اگر ایسا ہے تو میتھیو کو ضرور پتا چل جائے گا اور دوسرا طالب علموں اور کرکوں کو بھی معلوم ہو جائے گا۔ کم سے کم اپنے جنم دن پر آرام سے سوتو سکوں گا۔ یہ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ تب ہی ایک شخص میرے کمرے پر آیا۔

”ہیلو مسٹر.....! میتھیو کی آواز آئی۔ مجھے پسینہ آنے لگا۔ میری نیند اڑ گئی۔ سارا کھایا پیا برادر ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ میتھیو کو پتا چل گیا ہے۔ بوڑھے کو پتا چل گیا ہو گا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسا کہ اندر ہیرے میں یکا یک میں فلیش لائٹ کی زد میں آ کر پکڑا گیا تھا۔

میتھیو کیا پوچھنے والا تھا؟

مجھے ایسا لگ جیسے خوف کے مارے دم کھل جائے گا۔

”میں نے کہا: میں سینیما دیکھنے گیا تھا۔ وکٹر ہیو گوکی لائزبل لگی ہوئی ہے۔ یہ پچھا آپ کو ضرور دیکھنا چاہیے۔“

”ہوں، ہوں“

”کیا آپ کھانا کھا چکے ہیں؟ مجھے قطعی بھوک نہیں ہے۔ راستے میں ہم لوگ مارڈن ہوٹل چلے گئے تھے۔“

”بہت بہت شکریہ، میں کھانا کھا چکا ہوں۔“

”اوہ! تو آپ آرام کیجیے۔“

”گڈ نائٹ۔“

”اچھا! گڈ نائٹ۔“

(ولیوم محمد بشیر)

## مشق

### سوالات

1. اس افسانے کا عنوان ”جنم دن“ کیوں رکھا گیا ہے؟ وضاحت کیجیے۔
2. ”جنم دن“ انسانے کا خلاصہ بیان کیجیے۔
3. افسانہ نگار کے جنم دن کے واقعات میں کس واقعے نے آپ کو بے حد متأثر کیا اور کیوں؟
4. انسانے کے مرکزی کردار کی معاشی تنگدستی کا حال اپنے انفتوں میں لکھیے۔



## نیزم ورما

2005 تا 1929

نیزم ورما ہندی زبان کے منفرد اور ممتاز فکشن نگار ہیں۔ وہ 3 اپریل 1929 کو شملہ (ہماچل پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی۔ اس کے بعد دہلی آگئے جہاں سینٹ اسٹینفس کالج (دہلی یونیورسٹی) سے تاریخ میں ایم۔ اے۔ کیا۔ کچھ عرصے تک تدریس کا کام بھی کیا۔ 1959 میں چیکو سلووا کیہ کے مصنفوں کی انجمن کی دعوت پر پراؤ (چیکو سلووا کیہ) چلے گئے اور سات سال تک وہیں رہے۔ اس دوران میں انہوں نے کئی چیک شاہکاروں کے ہندی ترجمے کیے۔ اپنے قیام یورپ کے دوران انہوں نے ”ٹائمز آف انڈیا“ کے لیے وہاں کے تہذیبی و ثقافتی اور سیاسی و سماجی مسائل پر کئی فکر انگیز مضمایں اور روپورتاژ بھی لکھے۔

نیزم ورما ایک بے مثال تخلیق کار ہیں۔ انہوں نے افسانہ، ناول، ڈراما، سفر نامہ اور ڈائری، غرض کر کی صنفوں میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ ”پرندے“ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد شائع ہونے والے افسانوی مجموعوں میں ”جلاتی جھاڑی“، ”پچھلی گرمیوں میں“، ”بیچ جبٹ میں“، ”کوئے اور کالا پانی“ وغیرہ ہیں۔ نیزم ورما کے ناول ”وے دن“، ”لال ٹین کی چھت“، ”ایک چیتھرا سٹھ“، ”رات کا روپورٹ“، ”اتم ارنیہ“ ناموں سے شائع ہو چکے ہیں۔ ”چڑوں پر چاندنی“، ”ہر بارش میں“ وغیرہ ان کے سفر نامے ہیں۔ تقدیمی اور تہذیبی مسائل پر مضمایں کے کچھ مجموعے اس کے علاوہ ہیں۔

نیزم ورما کو ان کی ادبی خدمات پر مختلف اداروں کی طرف سے متعدد انعامات و اعزازات سے نوازا جا چکا ہے جن میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، سادھنا سٹمان، رام منوہر لوبھیا سٹمان، مورتی دیوی ایوارڈ، میھلی شرمن گپت سٹمان اور بھارتیہ گیان بیٹھ کا انعام خاص طور پر مقابل ذکر ہیں۔ 2001 میں حکومت ہند نے انہیں پدم بھوشن کے اعزاز سے سرفراز کیا۔ نیزم ورما کا انتقال دہلی میں ہوا۔

## جلتی جھاڑی

میں اس شہر میں پہلی بار آیا تھا۔ سوچا تھا، چند دن رہ کر آگے چلا جاؤں گا لیکن بعض ناگزیر وجوہات سے یہاں رُک جانا پڑا۔ دن بھر ہوٹل میں رہتا اور جب اُب جاتا تو اکثر گھومتے ہوئے اُس مقام کی طرف قدم بڑھ جاتے۔ اجنبی شہروں میں بھی ہر مسافر اپنے پسندیدہ گوشے ڈھونڈ لیتا ہے۔

کئی پار وہاں جانے کی طبیعت ہوئی۔ رات کو کسی سستے ریஸورینٹ کی تلاش کرتے وقت اکثر اس طرف نگاہ چلی جاتی یا کبھی ٹرام کی کھڑکی سے پُل پار کرتے ہوئے ایک دبی سی خواہش جاگ آختی۔ دل چاہتا، یہیں اُتر جاؤں لیکن ایک ہلکی سی بچک ابھر آتی اور میں اس کے نیچے ڈب جاتا ہوں۔

وہ دن کچھ الگ سارہا ہوگا۔ میں دن بھر ہوٹل کے کمرے میں سوتا رہا۔ کچھ ضروری خط لکھنے اور انہیں پوسٹ کرنے کے بہانے باہر چلا آیا۔

والپسی میں میں نے جان بوجھ کر راستہ بدل لیا۔ ممکن ہے کہ میں نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا ہو۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔ جب کبھی میں دن بھر سوکر باہر آتا ہوں تب خود کو ایک نئے سرے سے ڈھیلا چھوڑ دینے کی خواہش ہوتی ہے۔ خاص طور پر اجنبی شہروں میں جہاں ہمیں کوئی نہیں پہچانتا اور ہم کسی شرمندگی اور چھمک کے بغیر ایک راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے پر ہو لیتے ہیں۔

ایسا ہی پت جھڑ کا ایک دن تھا جب میں وہاں چلا آیا تھا۔ وہ ایک جزیرہ تھا۔ شہر کے کنارے جہاں پہاڑی شروع ہوئی ہے، ندی کے دو دھارے پنجی کی طرح اسے نیچے سے کاٹ گئے تھے۔ پُل کے نیچے لمبی گھاس پانی میں بھیگی رہتی تھی۔ کنارے پر دور دور لال تختوں کی بچیں پڑی تھیں۔ ان دونوں یا کثرا خالی رہتی تھیں۔ بالکل خالی بھی نہیں۔ پشتے گا تارُن پر جھڑتے رہتے۔ جب کبھی ہوا کا کوئی جھونکا نہیں اڑا لے جاتا تو وہی جھونکا واپس مُڑ کر دوسرے پتوں کو ان پر بکھیر دیتا۔ وہ کبھی زیادہ دیر تک خالی نہیں رہتی تھیں۔ پانی بہتار ہتا۔ اس کی آواز کے ساتھ ہمیشہ ایک اور آواز دل میں آتی تھی..... کسی دن وہاں جاؤں گا۔

ایسے ہی ایک پت جھڑ کے دن میں وہاں چلا آیا تھا۔ کنارے کنارے چلتے ہوئے میں ان بچوں سے الگ تھا جو پُل کے نیچے کھیل رہے تھے۔ انہوں نے شاید مجھے دیکھا بھی نہیں۔ وہ پتوں کا ڈھیر بنادیتے تھے اور انھیں ماچس سے جلا کر بھاگ جاتے تھے۔

شام کی مدد میں دھوپ میں دھوئیں کے دائرے پھیل جاتے۔ ایک سوندھی بُل جزیرے کے ارد گرد ہوا میں پھیل جاتی تھی۔ میں پُل سے دور چلا آیا۔ دوسری طرف پیڑوں کی نگی شاخیں پانی کو چھوڑ رہی تھیں۔ وہاں گیلی گھاس کا ایک نکڑا ندی کے کنارے تک چلا گیا تھا۔ ڈھلان پر اترتے ہی نگاہ اچاک اس پر نکل گئی۔ پاؤں ٹھٹھک گئے۔ وہ بوڑھا آدمی تھا۔ ایک چھوٹی کرسی پر بیٹھا تھا۔ بالکل خاموش، بے حرکت۔ منہ میں پائپ دبی تھی، جونہ جانے کے کی بجھ چکی تھی۔ ہاتھ میں مچھلی کپڑنے کا کاثنا تھا۔ ندی کے کنارے گندے پانی میں دور تک ڈوبا ہوا لیکن اس کا دھیان کانٹے کی طرف نہیں تھا۔ وہ جزیرے سے پرے شہر کے پاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رہ کر منہ میں دبی پائپ بیل اٹھتی تھی۔ وہ جزیرے کا ساکت کنارہ تھا۔ میں بے مقصد گھومتا ہوا تھک گیا تھا۔ اپنا چڑے کا بیگ میں نے بھیل گھاس پر رکھ دیا اور وہیں بیٹھ گیا۔

میرے بالکل قریب ایک نگاہ درخت کھڑا تھا۔ بارش میں بھیگا لیکن گرم۔ اس کی گرمی دھیرے دھیرے مجھے چھوٹے لگی۔ پچھلے ایک بیٹتے سے اس شہر میں پانی برستا رہا تھا۔ گھاس کے نیچے مٹی نہ تھی اور اتنی ملائم کہ پیر نیچے دینے لگتے تھے۔ یہ پہلا دن تھا جب بارش تھی۔ بادل اب بھی تھے۔ کچھ جزیرے پر، کچھ ہٹ کر شہر کی پہاڑی پر لیکن اب وہ خالی اور ہلکے تھے اور ہوا میں اڑتے معلوم ہوتے تھے۔



میں بہت دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ اس دوران بوڑھے نے ایک بھی مجھلی نہیں پکڑی۔ ایک بار کا نشایلا تھا۔ اس نے لپک کر ڈنڈی کچھی۔ میں نے سوچا، اب ایک تر بتا ہوا گوشت کا لوٹھرا اور آئے گا۔ میں خود شاید اتنا والے پن میں پانی کے پاس چلا آیا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے ندی سے کانٹا باہر نکالا۔ پھر میری طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ کانٹا خالی تھا۔ مجھلی بہت صفائی سے اپنا کھانا چڑا لے گئی تھی۔

ہم دونوں پھر اپنی اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ بوڑھے نے اپنے کائیں میں چارہ بھرا اور پھر دور ہوا میں اچھال کر اسے پانی میں ڈبو دیا۔ بہتے پانی پر ایک چوڑا سادا سڑہ پھیل گیا۔ دھوپ میں پارے کی طرح چمکتا ہوا اور پھر مٹ گیا۔ اس نے اپنی پاسپ دوبارہ سُلگالی اور پُرانے اور کوٹ کے کالرو اور پکانوں تک چڑھا لیے۔ پانی پر تیرتی دھوپ کا ایک حصہ پچوں کے لئے سا گھومتا ہوا کنارے آگلتا تھا اور ٹوٹ جاتا تھا، لیکن بوڑھے کا دھیان ادھرنیں تھا۔ میں طے نہیں کر پایا کہ اس کی آنکھیں کس خاص مرکز پر نکلی ہیں۔ اس کی آنکھیں کھلی ہیں یا بند، یہ بھی ٹھیک ٹھیک کہہ پانا مشکل تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ میرا گمان پختہ ہوتا گیا۔ یہ اندیشہ کس بات کے لیے تھا، میں آج تک ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا لیکن یہ سچ ہے کہ انجانے شہادات ضرور تھے۔ وہ صرف ایک بار مجھے دیکھ کر ہنسا تھا لیکن حیرت ہے کہ اُس وقت بھی اس نے مجھے پورے طور پر نہیں دیکھا تھا، میری طرف متوجہ ہو کر اسے ہنسنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

مجھے اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ اُسے میرے وجود کا ذرا بھی احساس نہیں۔ حالاں کہ میں اس کے اتنے قریب بیٹھا ہوں۔ یہ مجھے بے حد غیر نظری معلوم ہوا۔ انجانے شہر میں اپنانیت کی بھوک اتنی مستحکم ہوتی ہے، یہ اس سے پہلے میں نہیں جان پایا تھا۔

بے شک وہ کسی مخصوص شے پر اپنی آنکھیں ٹکائے ہوئے تھا، ایسا کچھ جو میری آنکھوں کے دائے سے باہر تھا۔ لیکن میں نے کوشش کی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے شہر کا سب سے پرانا گل تھا۔ اُس کے پرے نیشنل تھیٹر کی دیواریں اور چھت اور نیچے میں گل کا ٹاور جو شام کی ڈوبتی روشنی میں بھلملا رہتا تھا، لیکن یہ ایسی چیزیں تھیں جنہیں اس شہر میں چلتے ہوئے اور گلیوں سے گزرتے ہوئے ہم روز دیکھتے تھے۔ ان میں کچھ خاص یا غیر معمولی کم از کم اس بوڑھے کے لیے تو نہیں تھا جو شاید برسوں سے اس شہر میں رہتا تھا۔ میرا گمان پھر بیدار ہونے لگا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ہے انوکھا یا بالکل علاحدہ..... لیکن کیا یہ آدمی دیکھ سکتا ہے؟ اچانک میرے ذہن میں یہ بے تکا خیال اُبھرا۔ وہ بہت بوڑھا ہے۔ ہوا کا ہلاکا سا جھونکا آیا۔ دھوپ دھیرے دھیرے اُترنے لگی۔ پورے جزیرے پر ایک مخدوم خاموش گھرنے لگی۔ پتے پانی پر جھوڑتے تھے اور بہہ جاتے تھے۔

صرف دھوپ کے ٹکڑے باقی رہ گئے تھے۔ پتھر وں پر، ٹھینیوں پر۔ کچھ دیر بعد شام انھیں لے کر چلی جائے گی۔ صرف ہم دونوں وہاں بننے رہیں گے۔

لیکن نہیں..... وہ جارہا ہے۔ میری نگاہیں اچانک اور پڑھ گئیں۔ وہ سچ مجھ جارہا تھا۔ اس نے مچھلی پکڑنے کے کانٹے کو پانی سے باہر نکال لیا۔ کیوں کی کرسی کو لپیٹ کر بغل میں دبایا۔ اس نے بہت پُرانا زد باؤلر ہیئت پہنا اور پانپ منھ سے نکال کر جیب میں رکھ لیا۔ مچھلی پکڑنے کا جھولا جو خالی تھا اس نے کانٹے کی ڈنڈی پر لٹکا لیا تھا۔

نے جانے کیوں اس لمحے میرے اندر ایک عجیب سی حُجھِ حُجھی کھلیل گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میں بہت پیچیدہ طریقے سے اُس آدمی پر منحصر ہو گیا ہوں اور اس کے جانے سے ہی میں وہ کھودوں گا جو ایک مدت سے میرے اندر پلتا رہا ہے۔ اس کا یہاں رہنا شاید میرے رہنے سے جو ہوا ہے لیکن اس لمحے شاید کچھ ہوا۔ شاید سوکھ پتوں کی کھڑکھڑا ہٹ یا شاید کوئی پتھر پانی میں لٹھک گیا ہو گا اور وہ چونک گیا۔ اس کے پاؤں دھرتی پر بندھے سے رہ گئے جیسے کسی نے اُسے پکڑ لیا ہو۔ اس نے ایک بار پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ ندی کے بہت پانی کی طرف اور پھر تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا میرے سامنے سے نکل گیا۔

جاتے ہوئے اس نے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ کچھ دیر تک جزیرے میں اس کے نیچے دبتے پتوں کی چرمراہٹ سُٹائی دیتی رہی۔ پھر سب پہلے جیسا خاموش ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اسی جگہ پر بیٹھ گیا جہاں کچھ دیر پہلے بوڑھا مچھوارا بیٹھا ہوا تھا۔ گیلی مٹی پر اُس کے جوتوں کے نشان اب بھی دکھائی دیتے تھے۔ بہت لمبے نہیں لیکن کافی چوڑے اور آگے کی طرف تھوڑے بے ڈول۔ وہ مجھے معمولی معلوم ہوئے اور زیادہ دیر تک میرا دھیان ان پر نہیں ٹک سکا۔

تھوڑا اور وقت گزرا۔ بعد میں جب میرا دھیان اپنی طرف گیا تو مجھے حیرانی سی ہوئی۔ دراصل ایک وقف سے میں بغیر کسی خاص ارادے کے اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں کچھ دیر پہلے بوڑھے کی آنکھیں لگی تھیں۔ کنارے کے پاس لگی جہاڑیوں پر کچھ پرندے اُڑے۔ پُشتے سے کچھ دور ایک بہت پُرانے گرجا گھر کے شیشے پر آخری دھوپ کا دھنبا چک رہا تھا۔ اس کا سایہ ایک ڈبڈباتی سرخ آنکھ کی طرح دریا کے سچ چک جاتا تھا۔

میں نے سوچا، کوئی نہیں جانے گا کہ کچھ دیر پہلے تک وہ بوڑھا یہاں، اسی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس خیال سے مجھے اطمینان ہوا کہ میں نے اس سے چھکارا پالیا۔ بہت ممکن ہے کہ وہ محض مگان ہو، ایک جھوٹا بھٹکا و جو اکثر اجنیہ شہروں میں گھومتے ہوئے ہو جاتا ہے۔ ہٹل کے کمرے میں پیچھے ہی جب میں اپنے کونے سرے سے اکیلا پاؤں گا توہر چیز اپنے موزوں اور اصلی دائرے میں لوٹ آئے گی۔

سامنے پل پر ٹرام جا رہی تھی۔ اس کی بیویوں کا سایہ تکمیلے جھال رکی طرح پانی پر پھسلتا رہا۔ کچھ لوگ کھڑکی سے باہر اس جزیرے کو دیکھ رہے تھے بالکل اسی طرح فطری ڈھنگ سے جیسے میں آپار جاتے ہوئے دیکھا کرتا تھا، لیکن اب میں کھڑکی سے لکھے ہوئے ان کے چہروں کو دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ اپنے آپ پر شہبہ ہونے لگا جیسے یہاں آ کر میں نے کوئی غلطی کر ڈالی ہو..... مجھے بھی اُن کی طرح پل کے پار سیدھے چلے جانا چاہیے تھا۔  
کوشش کروں تو اب بھی جاسکتا ہوں صرف.....

مجھے اپنے پیچھے ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ دوڑکے میری طرف بہت دیگی رفتار سے چلے آرہے تھے۔ اس شہر کے دوسرا لڑکوں کی طرح اُن کے سرگول اور نیلی ٹوبیوں سے ڈھکے تھے۔ چھوٹے لڑکے کے ہاتھ میں ایک چوڑا رنگ برلنگا رومال تھا۔ وہ پیڑوں سے جھٹرے ہوئے پیلے اور مر جھائے پتوں کو اُس رومال میں بٹوتا جا رہا تھا۔ بڑا لڑکا جو پہلے سے قد میں اوپر جاتا تھا لیکن عمر میں زیادہ بڑا نہیں لگتا تھا، بے دلی سے ایک چھوٹی سی ٹہنی ہوا میں گھما تا ہوا چل رہا تھا۔ دونوں جزیرے کے آخری کنارے تک آگئے تھے۔ اس جگہ تک جہاں کنارے پر لگی جھاڑیاں پانی میں بھیگ رہی تھیں۔

چھوٹا لڑکا دبے قدموں سے ڈھلان پر اترنا اور اس نے رومال میں بندھے سارے پتوں کو پانی میں ڈال دیا۔ پھر اس نے اپنے کوٹ کی دونوں جیبوں سے کچھ اور پتنے نکالے۔ گلی مٹی میں انتھڑے پتے۔ اور پھر انھیں بھی دونوں ہاتھوں سے بہتے پانی میں اُس نے بہا دیا۔ اس نیچے مجھے محسوس ہوا کہ بڑا لڑکا مجھے دیکھ رہا ہے۔ اب بھی وہ چھوٹی سی ننگی ٹہنی ہوا میں گھما رہا تھا۔ اس کے دانتوں کے نیچے گھاس کا ایک تکا تھا جسے وہ برا بر چبائے جا رہا تھا۔ چھوٹا لڑکا پتوں کو بہا کر اور پر آ گیا۔ دونوں اب ایک ساتھ کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔

ایک نگاہ ہوتی ہے۔ سیدھی، مستقل اور مستحکم۔ اس میں ہم بندھ جاتے ہیں اور ریل کی طرح کھنچتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔ سوئی کی نوک کے نیچے جیسے کوئی کیڑا دب جاتا ہے، بدھواں ہو کر تملاتا ہے پھر ٹھہر جاتا ہے، حواس باختہ، بے ہوش اور ساکت..... ویسے ہی، بالکل ویسے ہی۔

پھر بڑا لڑکا آگے بڑھا۔ بڑی سادگی سے وہ میرے نزدیک چلا آیا۔ مجھے محسوس ہوا، اس کا میرے پاس چلا آنا بالکل فطری تھا۔ ایسا لگا کہ پچھلے چند محوں سے میں خود اس کے لیے منتظر تھا۔

آج کیسے ہو؟ اس نے پوچھا۔ میں کچھ بھی کہہ پاتا لیکن مجھے محسوس ہوا، پیچھے کھڑا لڑکا بہت ہی نفرت آمیزانداز میں مسکرا رہا ہے۔

”آج بھی خالی ہاتھ ہو؟“

”خالی ہاتھ؟“ میری آنکھیں اپنے ہاتھوں پر جھک گئیں۔ وہ سچ مجھ خالی تھے۔

”میرا مطلب ان سے نہیں ہے۔“ بڑے لڑکے نے اسی پر اعتماد اور واضح آواز میں کہا: ”آج بھی تم کچھ نہیں کپڑا پائے؟“

”لیکن تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں وہ نہیں ہوں، جسے تم تلاش کر رہے ہو۔ وہ تو کب کا چلا گیا۔“

”کہاں؟“

میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ جزیرے پر ڈوبتے سورج کی پیلی اور میلی سی لاٹی پھیل گئی تھی۔ دورپل کے پاس جلتے پتوں کے ڈھیر سے اب بھی دھوال اُٹھ رہا تھا لیکن وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ صرف ہوا چلنے سے پتنے بجنوں سے لڑھک کر زمین پر گرنے لگے تھے۔

”وہ اب یہاں نہیں ہے،“ میں نے کہا لیکن نہ جانے کیوں اس بار میری آواز میں پہلے جیسا استکام نہیں تھا۔

”لیکن تم تو یہاں ہر روز آتے ہو؟“ چھوٹے لڑکے نے کہا۔ ”اونہ دیکھو، تمہارے بوٹ کے نشان اب بھی ہیں۔“

میں نے دیکھا، میرے پیر سے قریب، اب بھی وہ نشان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ بھرا بھرا سا، چوڑا اور آگے کی طرف سے ذرا بے ڈول۔ ٹوٹی، اُکھڑی ہوئی گھاس کے نیچے جوتے کی صاف اور سالم چھاپ۔ بدن کے ایک کٹھے کی طرح وہ نشان گیلی زمین سے چپکا رہ گیا تھا۔

”لیکن وہ میرا نہیں ہے۔“ کچھ بے یقینی کے ساتھ کمزور لبجھ میں میں نے رہ عمل کا اظہار کیا۔ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ دونوں انتظار کر رہے ہیں کہ ثبوت دینے کے لیے اپنے پاؤں آگے بڑھاؤں گا۔ خود میرے لیے یہ بات غیر فطری نہیں تھی لیکن کوئی طاقت مجھے روک رہی تھی۔ میں پوری طاقت سے اپنے پیروں کو لمبی گھاس میں چھپائے کھڑا رہا۔ اس کے بعد کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایسا محسوس ہوا کہ ان کی دل چھپی میری ذات میں ختم ہو گئی۔ چھوٹا لڑکا حسب سابق اپنے رومال میں نیچے گرے پتوں کو بٹرتا ہوا درنکل گیا۔ بڑا لڑکا وہاں کچھ دیر تک کھڑا رہا۔ میری طرف سے بے فکر اور لاتعلق۔

میں اچانک چوک گیا۔ وہ اسی جگہ کھڑا تھا جہاں بوڑھا چلتے چلتے چند لمحوں کے لیے ٹھٹھک گیا تھا۔ اسی جگہ اس کی آنکھیں کسی مرکز پر جا گئی تھیں، جہاں بوڑھا اتنی دیر سے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔

یہ محض اتفاق تھا، اس سے زیادہ کچھ نہیں کیوں کہ کچھ دیر بعد، میں اس نے اپنے پاس پڑے ایک ڈھیلے کوٹھوک رکار کر پانی میں اڑھکا دیا۔ پانی ہلا۔ کہیں بہت نیچے بہت سی پرتیں کھلتی چلی گئیں۔ جھاڑی کے پاس گلی مٹی پر ریگتے ہوئے کیڑوں کی قطار لمحہ بھر ڑک کر پھر آگے بڑھ چلی۔ اس نے منہ کا تنکا پانی میں تھوک دیا۔ سر سے ٹوپی اُتار کر اُسے ہوا میں ایک دوبار جھٹکا کر اس نے پین

لیا۔ پھر اسی پُرانے انداز سے ٹہنی کو ہوا میں گھما تا ہوا چھوٹے ٹڑکے کے پیچھے چل دیا۔ اتنا ہی ہوا۔ دونوں چلے گئے تھے، مجھے اپنے حال پر چھوڑ کر۔ میں پھر وہاں اکیلا چھوٹ گیا لیکن ان کے جانے کے بعد پہلے جیسا اکیلا پن واپس نہیں آیا۔ جب تک اکیلا پن ساتھ رہتا ہے، صحیح معنوں میں تب ہم اکیلے ہوتے ہیں۔ اب میں صرف اپنے ساتھ رہتا اور مجھے یہ خیال خوف ناک لگا کہ وہ دونوں مجھ سے کچھ چھین کر لے گئے ہیں جو اب تک میرے ساتھ تھا۔ اس کے بعد میں زیادہ دیر تک وہاں نہیں بیٹھ سکا۔ میں پھر اپنی پُرانی جگہ واپس آگیا۔ پیڑ کے تنے کے پاس۔ جہاں اب بھی میرا بیگ رکھا تھا۔

شہر کی پہاڑیاں اب اندر ہیرے میں چھپ گئی تھیں لیکن ان کے اوپر پیچھے کی طرف سے اٹھتے ہوئے گوتحک گرجا کے مینار ایک نیم فراموش خواب کی طرح ہوا میں لگے تھے۔ انھیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے ایک کھیم شیم پرندہ اڑتا ہوا اچانک ٹھٹھک گیا ہو، پہاڑی اور گھلے آکاش کے درمیان اس کے دونوں پر اور پر کی طرف چڑھنے والے ہوں اور پھر اگئے ہوں خالی ہوا میں۔ جزیرے سے کچھ دور شہر کے پُرانے بُل کی بُتیاں جھکتی سی ایک کے بعد ایک جلنے لگی تھیں۔ بہتے پانی میں ان کا سایہ ٹھٹھاتی موم ڈیوں کی طرح کانپ جاتا تھا۔

بہتے پانی کو دیکھنا ایک عجیب احساس ہے۔ زیادہ دیر تک ٹکٹکی لگا کر دیکھتے رہو تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے وجود میں سے بھی کچھ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ ہمارے اندر دوڑی کے جو حصے ہیں، جنھیں کبھی کبھار سوتے ہوئے نہیں کیا ہریں بھگو کر واپس لوٹ جاتی ہیں جو ہماری آدمی اندر ہی زندگی کا حصہ ہیں۔ لگتا ہے، جیسے وہ سیاہ گہرے پانی کے اندر سے انھیں جھانک رہے ہوں، ہمیں دیکھ رہے ہوں۔

کیا پہلے میں نے کبھی دیکھا ہے۔ ان دونوں بڑکوں کو، جو ابھی ابھی یہاں سے چلے گئے۔ اس شہر میں میں اجنبی ہوں۔ اگر آج رات اچانک میں یہاں سے چلا جاؤں تو ہوٹل کے مینبر اور پولیس کے علاوہ کسی کو کچھ بھی پتا نہیں چلے گا۔ نہیں، یہ صرف میرا گمان ہے۔ انھوں نے مجھے بیچانے میں غلطی کی ہے۔ ایسا دھوکا اکثر ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے، وہ مذاق کر رہے ہوں۔ بچے اکثر غیر ملکیوں کو دیکھ کر مذاق کرتے ہیں۔

مجھے ذرا سی خوشی ہوئی کہ وہ چلے گئے۔ میں جان بوجھ کر اس خوشی کو چھاپا تارہا جیسے میں اس پر شرمندہ ہوں۔ جزیرے پر صرف جلتے ہوئے پتوں سے دوچار بجھتی ہوئی لپٹیں اٹھ جاتی تھیں۔ بچ انھیں اسی طرح جلتا ہوا چھوڑ کر بہت پہلے جا پکے تھے۔ اب چاروں طرف خاموشی تھی۔ اسی طرح تو اتر کے ساتھ، جیسے بہتے پانی کی آواز۔ اس بیچ جزیرہ اور ندی کی سرحد مٹ گئی تھی یا شاید مٹی

نہیں تھی۔ اندھیرے میں پانی کو پہچانا مشکل تھا۔ بہت غور سے دیکھنے پر ایک ہلکی سفید ریقق لیکر نظر آتی تھی جس پر شام کی ہوا تھی جو کبھی پانی میں بیل کی بیتوں کو چھوڑ کر آگے کھسک جاتی تھی۔

سردی اچانک بڑھ گئی۔ میں وہاں سے جانے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ میں وہاں بالکل اکیلانہیں ہوں۔ دائیں جانب، جہاں جھاڑی تھی، ہلکی سی سرسرابہٹ ہوئی۔ پہلے دو دھنڈے سائے دکھائی دے رہے تھے، بعد میں انھیں صاف الگ دیکھ پایا۔ لڑکی کے اسکرت کا اگلا حصہ شاید جھاڑی میں پھنس گیا تھا۔ اور وہ اسے نکالنے کے لیے نیچے ہمکلی تھی۔ شاید جھاڑی کی سرسرابہٹ نے ہی میرا دھیان اُن کی طرف کھینچا۔ اُس کے پیچھے جو دوسرا آدمی تھا، اُسے میں پہلی نگاہ میں دیکھنیں پایا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ بغیر ہلے ڈلے بالکل خاموش کھڑا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ اس کے لمبے اور کوت نے اندھیرے میں اسے کچھ اس ڈھنگ سے چھپا لیا تھا کہ غور سے دیکھے بغیر اس کے علاحدہ وجود کو پہچانا ناممکن تھا۔

میں نے سوچا: مجھے وہاں سے چپ چاپ اٹھ کر چلے جانا چاہیے.....

دوسرے دن صبح میں وہ شہر ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔

(نرمل و رما)

## مشق

### سوالات

- .1. نزل و رمانے سیر و سیاحت کے دوران مسافر کی جن کیفیات کا ذکر کیا ہے، انھیں اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔
- .2. افسانہ نگار نے بوڑھے مچھوارے کی تصویر کیسی کس انداز میں کی ہے؟
- .3. جزیرے کے کنارے اور پل کے ساتھ غروب آفتاب کے جو مناظر نزل و رمانے پیش کیے ہیں، ان پر تبصرہ کیجیے۔
- .4. نزل و رما کے اس افسانے کو مختصرًا اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

## انشائیہ

لفظ انشا اردو میں کئی طرح سے استعمال ہوتا ہے۔ انشائیہ بھی اسی لفظ سے بنتا ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ لفظ Essay عربی لفظ ”اسعی“ سے نکلا ہے جو لفظ انشا کا بدل ہے۔ ”اسعی“ فرانسیسی میں Essai اور انگریزی میں Essay بناتا ہے۔

ابتداء میں مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری میں زیادہ فرق نہیں تھا، مگر رفتہ رفتہ ان میں فرق پیدا ہوتا گیا، یہاں تک کہ انشائیہ ایک علاحدہ صنف قرار پائی۔ انشائیہ نگار اپنے مخصوص ذاتی مشاہدات اور تاثرات کو بے باکی اور بے تکلفی سے بیان کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انشائیہ میں سخیدہ اور غیر سخیدہ موضوعات سے متعلق خیال کے تمام مرحلے خوش طبی کے ساتھ طے کیے جاتے ہیں۔ یہ بات میں بات پیدا کرنے کا فن ہے۔ انشائیہ نگار مفہوم سے غالی گفتگو میں بھی معنی پیدا کر دیتا ہے لیکن کبھی کبھی اس کے بر عکس بھی ہوتا ہے۔ اختصار اس کی بیچان ہے۔ اس میں مزاج یا ٹھھوٹ کی جگہ بلکل پھلکی زیر لب ہنسی پنہاں ہوتی ہے۔ خیال آفرینی اس کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

اردو میں انشائیے کی ابتداء سرید احمد کے رسائل ”تہذیب الاخلاق“ سے ہوتی ہے۔ مولوی نذری احمد اور ذکاء اللہ کے بعد ”اوده تیج“ اور ”مخزن“ نے اسے فروغ دیا۔ میرناصر علی، سجاد حیدر یلدزم، سلطان حیدر جوش، سجاد انصاری، نیاز فتح پوری، مہدی افادی، فرحت اللہ بیگ، قاضی عبدالغفار، پطرس بخاری، سید محفوظ علی بدایونی، خواجہ حسن نظامی رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی نے اس صنف کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔



## پطرس بخاری

1898 تا 1958

ان کا اصلی نام احمد شاہ بخاری تھا۔ اردو ادب میں پطرس کے قلمی نام سے مشہور ہوئے۔ پشاور میں پیدا ہوئے۔ انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج، لاہور میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ اس کے بعد دہلی ریڈ یوائیشن سے وابستہ ہو کر ڈائرکٹر جزل کے عہدے پر مامور رہے۔

پطرس بخاری اردو ادب کے معنوں وہے چند لکھنے والوں میں سے ہیں جنہوں نے اگرچہ کم لکھا، لیکن شہرت بہت حاصل کی۔ پطرس کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ”مضامین پطرس“، ملک گیارہ مضامین پر مشتمل ہے، مگر اس مختصر کتاب میں قہقہوں کی ایک رنگارنگ دنیا آباد ہے۔ انہوں نے انگریزی ادب کے مطالعے سے فائدہ اٹھایا۔ ان کی تحریر پر انگریزی طرز کی گہری چھاپ ہے۔ ان کی عبارت میں شوخی، شنکھنگی، روانی اور بے ساختہ پن نمایاں ہے۔ سیدھی سادی بالتوں سے مزاح پیدا کرنا، لفظوں کے الٹ پھیر سے جملے پخت کرنا اور خود کو مذاق کا موضوع بنانا کر اپنے اوپر ہنسنا ان کا خاص انداز ہے۔ وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی سچائیوں پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو خوب ہنساتے ہیں۔ ان کی نظر افت نہایت خوش گوارا ثرچھوڑتی ہے۔

زیر نظر مضمون ”مرحوم کی یاد میں“، پطرس بخاری کا شاہکار ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے ایک دوست کی پرانی سائیکل کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس پرانی سائیکل پر سوار ہو کر اپنے سفر کرنے کی روادادت نے دلچسپ پیرائے میں بیان کی ہے کہ اسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ پطرس کے مزاح میں شنکھنگی اور خوش مذاق کا انداز بہت نمایاں ہے۔ اپنے فطری مزاح کی وجہ سے پطرس کی تحریریں ہمیشہ شوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔

## مرحوم کی یاد میں

ایک دن مرزا صاحب اور میں بآمدے میں ساتھ ساتھ کریاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چند اس ضرورت باقی نہیں رہتی اور دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف انداز ہو سکتے ہیں، یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے، لیکن میں زمانے کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے و قلنے کے بعد ایک موڑکار گزر جاتی تھی، میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ میں جب کبھی کسی موڑکار کو دیکھتا ہوں، مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر تقسیم کی جاسکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موڑکار اس اداسے گزر جائے کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے تو اس دن گھر میں آکر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں جو میں نے ایف۔ اے۔ میں پڑھی تھی اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگتا ہوں کہ شاید تم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آجائے۔

میں کچھ دیر تک آئیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی، آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور مرزا صاحب سے مخاطب ہو کر بولا۔

”مرزا! ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟“

مرزا صاحب بولے، ”بھی کچھ تو ہو گانے آخر!“

میں نے کہا، ”میں بتاؤں تھیں؟“

کہنے لگے ”بولو۔“

میں نے کہا، ”کوئی فرق نہیں۔ سنتے ہو مرزا کوئی فرق نہیں، ہم میں اور حیوانوں میں، کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں۔ ہاں ہاں، میں جانتا ہوں کہ تم میں بیٹھنے کا لئے میں بڑے طاق ہو، کہہ دو گے حیوان بھگا لی کرتے ہیں، تم نہیں کرتے، ان کے دُم ہوتی ہے تمہارے نہیں ہوتی۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے

انضل ہیں لیکن ایک بات میں، میں اور وہ بالکل برابر ہیں، وہ بھی پیدل چلتے ہیں، میں بھی پیدل چتا ہوں، اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں۔ کچھ ہے تو کہو۔ میں چھپ ہو جاؤ، تم کچھ نہیں کہ سکتے، جب سے میں پیدا ہوا ہوں اسی دن سے پیدل چل رہا ہوں۔

”پیدل۔“ تم پیدل کے معنی نہیں جانتے، پیدل کے معنی ہیں سینہ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک ضرور زمین پر رہے، یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ بھی رہا ہے کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں، دوسرا اٹھاتا ہوں دوسرا رکھتا ہوں، پہلا اٹھاتا ہوں۔ ایک آگے ایک پیچھے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دامغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بیکار ہو جاتے ہیں، تجھیں مر جاتا ہے۔ آدمی گدھے سے بدتر ہو جاتا ہے۔

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران کچھ اس بے پرواںی سے سگریٹ پیتے رہے کہ دوستوں کی بے پرواںی پر رونے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے از حد حقارت اور نفرت کے ساتھ منہ ان کی طرف سے پھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ گویا میں جوانپی تکالیف بیان کر رہا ہوں وہ محض خیالی ہیں، یعنی میرا پیدل چلنے کے خلاف شکایت کرنا قابل توجہ ہی نہیں، یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا اچھا مرزا یوں ہی سہی، دیکھو تو، میں کیا کرتا ہوں۔

میں نے اپنے دانت پیچی کر لیے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سرمیری طرف موڑا، میں مسکرا دیا، لیکن میرے تہسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لیے بالکل تیار ہو گیا تو میں نے چباچبا کر کہا:

”مرزا! میں ایک موڑ خریدنے لگا ہوں،“

یہ کہہ کر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا بولے۔

”کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟“

میں نے کہا، ”تنا نہیں تم نے۔ میں ایک موڑ کا رخربیدنے لگا ہوں۔“ موڑ کا رائیک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موڑ کہتے ہیں، بعض لوگ کار کہتے ہیں لیکن چونکہ تم ضرورت سے زیادہ ذہین ہو، اس لیے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیے تاکہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔“

مرزا بولے۔

”ہوں —“

اب کے مرزا نہیں، میں بے پرواں سے سگریٹ پینے لگا۔ بھویں میں نے اوپر کو چڑھالیں، پھر سگریٹ والا ہاتھ منہ تک اس انداز سے لاتا اور ہٹا تھا کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔

ٿوڑی دیر کے بعد مرزا بولے۔ ”ہوں۔“

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے، مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مرزا کچھ بولے تاکہ مجھے معلوم ہو کہ کہاں تک مرعوب ہوا ہے، لیکن مرزا نے پھر کہا۔

”ہوں۔“

میں نے کہا ”مرزا جہاں تک مجھے معلوم ہے تم نے اسکوں اور کانچ اور گھر میں دو تین زبانیں سیکھی میں اور ان کے علاوہ تمھیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں، جو کسی اسکوں اور کانچ یا شریف گھرانے میں نہیں بولے جاتے، پھر بھی اس وقت تمھارا کلام ”ہوں“ سے آگئے نہیں بڑھتا۔ تم جلتے ہو مرزا۔ اس وقت تمھاری جو ذہنی کیفیت ہے اُسے عربی زبان میں حسد کہتے ہیں۔“

مرزا صاحب کہنے لگے ”نہیں، یہ بات تو نہیں، میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا، تم نے کہا میں ایک موڑ کار خریدنے لگا ہوں، تو میاں خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لیے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ”ونیرہ“ کا بندبست تو بخوبی ہو جائے گا، لیکن روپے کا بندبست کیسے کرو گے؟“

”یکتہ مجھے بھی نہ سوچتا تھا، لیکن میں نے بہت نہ ہاری۔ میں نے کہا۔“

”میں اپنی کئی تیقینی اشیائیں سکتا ہوں۔“

مرزا بولے ”کون کون سی۔ مثلاً؟“

میں نے کہا ”ایک تو میں اپنا سگریٹ کیس بیچ ڈاؤں گا۔“

مرزا کہنے لگے، ”چلو دس آنے تو یہ ہو گئے۔ باقی ڈھانکی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے تو سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس کے بعد ضروری یہی معلوم ہوا کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے روک دیا جائے۔ چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش ہو رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں؟ بہت سوچا اور آخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں۔ اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

مرزا بولے۔

”میں تمھیں ایک ترکیب بتاؤں — ایک بائیسکل لے لو۔“

”میں نے کہا“ وہ روپ پر کا مسئلہ تو پھر بھی جوں کا توں رہا۔“

کہنے لگے ”مفت۔“

”میں نے حیران ہو کر پوچھا“ ”مفت۔! وہ کیسے؟“

کہنے لگے ”مفت ہی سمجھو۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے، البتہ تم احسان قبول کرنا گوارانہ کرو تو اور بات ہے۔“

ایسے موقع پر جو بُنسی میں ہنتا ہوں، اس میں معصوم بچے کی صرفت، جوانی کی خوش دلی، اُنلتے ہوئے فواروں کی موسیقی اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ بُنسی ہنسا اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی بچھیں پھر گھٹٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ چنانچہ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یک لخت کوئی خوش خبری سننے سے دل کی حرکت بند ہو جانے کا جو خطہ ہوتا ہے اس سے محفوظ ہوں، تو میں نے پوچھا۔

”ہے کس کی۔؟“

مرزا بولے ”میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے وہ تم لے لو۔“

”میں نے کہا۔“ پھر کہنا۔ پھر کہنا۔“

کہنے لگے ”بھئی ایک بائیسکل میرے پاس ہے، جب میری ہے تو تمہاری ہے، تم لے لو۔“

یقین مانیے مجھ پر گھٹروں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پانی پانی ہو گیا۔ چودھویں صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا دیکھنے میں کہاں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کر لی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور منونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں۔

”میں نے کہا“ ”مرزا سب سے پہلے تو میں اس گستاخی اور ڈرختی اور بے ادبی کے لیے معافی مانگتا ہوں جو ابھی میں نے تمہارے ساتھ گھنگتوں میں روکھی، دوسرے آج میں تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے اور مجھے اپنی رحم دلی کے صدقے میں معاف کر دو گے، میں ہمیشہ تم کو از حد کمیہ، نمسک، خود غرض اور عَتیار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو ناراض ملت ہو۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے، لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے اور مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ میں کتنا قابل نفرت، تگ خیال اور حقیر شخص ہوں، مجھے معاف کر دو۔“

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو پھپانے کے لیے اس کی گود میں سر رکھ دیتا لیکن مرزا صاحب کہنے لگے۔

”واہ، اس میں میری فیاضی کیا ہوئی۔ میرے پاس ایک بائیکل ہے، جیسے میں سوار ہوں ویسے تم سوار ہوئے۔“  
میں نے کہا، مرزا مفت نہ لوں گا۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔“

مرزا کہنے لگے ”بس اسی بات سے میں ڈرتا تھا۔ تم حتاں اتنے ہو کہ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے — حالاں کہ خدا گواہ ہے — احسان اس میں کوئی نہیں۔“

میں نے کہا — ”خیر کچھ بھی سہی، تم حق مجھ مجھے اس کی قیمت بتا دو۔“

مرزا بولے، ”قیمت کا ذکر کر کے گویا تم مجھے کا نٹوں میں گھستیتے ہو اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی، وہ بہت زیادہ تھی اور اب تو وہ اتنے کی رہی بھی نہیں۔“

میں نے پوچھا ”تم نے کتنے میں خریدی تھی؟“

کہنے لگے۔ میں نے پونے دوسرو پے میں خریدی تھی، لیکن اس زمانے میں بائیکلوں کا رواج ذرا کم تھا۔ اس لیے قیمتیں ذرا زیادہ تھیں۔“

میں نے کہا ”کیا بہت پرانی ہے؟“

بولے، ”نہیں ایسی پرانی بھی کیا ہوتی، میراڑ کا اس پر کالج آیا جایا کرتا تھا اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج کل کی بائیکلوں سے ذرا مختلف ہے، آج کل تو بائیکلیں ٹین کی بنتی ہیں جنہیں کالج کے سر پھرے لوٹنے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی بائیکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔“

”مگر مرزا، پونے دوسرو پے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے، میں تو اس کی آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا۔“

مرزا کہنے لگے ”تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی ہی مانگتا ہوں — اول تو قیمت لینا نہیں چاہتا — لیکن —“

میں نے کہا ”نا مرزا قیمت تو تھیں لینی پڑے گی — اچھا تم یوں کرو — میں تھماری جیب میں کچھ روپے ڈالے دیتا ہوں — تم گھر جا کر گن لینا — اگر تھیں منظور ہو تو کل بائیکل بھیج دینا — ورنہ روپے واپس کر دینا — اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سو دا پکا ڈال — یہ تو کچھ دو کانداری کی بات معلوم ہوتی ہے۔“

مرزا بولے ”بھتی جیسی تمحاری مرضی، میں تو اب بھی کہتا ہوں کہ قیمت ویت جانے دو، لیکن میں جانتا ہوں تم نہ مانو گے۔“  
 میں اٹھ کر اندر کمرے میں آیا۔ میں نے سوچا، استعمال شدہ چیزوں کی قیمت لوگ عام طور پر آدھی دیتے ہیں — لیکن جب میں نے مرزا سے کہا میں آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا — تو مرزا اس پر مختصر نہ ہوا تھا۔ وہ تو بیچارہ ملکہ بھی کہتا تھا کہ تم مفت ہی لے لو، لیکن مفت میں کیسے لے لوں، آخر بائیکل ہے، ایک سواری ہے، فنون، گھوڑوں، موڑوں اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کھولا تو معلوم ہوا کہ ہست و بودکل چالیس روپے ہیں، چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں، پینتالیس یا پیچاس ہوں جب بات ہے۔ پیچاس تو ہونیں سکتے اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں تو چالیس ہی کیوں نہ دیے جائیں۔ جن رقموں کے آگے صفر آتا ہے، وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں، بس ٹھیک ہے چالیس روپے دے دوں گا۔  
 خدا کرے مرزا قبول کر لے۔

باہر آیا، چالیس روپے مُٹھی میں بند کر کے مرزا کی جیب میں ڈال دیے اور کہا، ”مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا، لیکن اگر ایک مفلس دوست کی حقیر سی رقم منظور کرنا تمھیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیکل بھجوادیتا۔“  
 مرزا چلنے لگے تو میں نے پھر کہا ”مرزا کل صح ضرور بھجوادیتا۔“ رخصت ہونے سے پہلے میں نے ایک دفعہ پھر کہا۔  
 ”کل صح آٹھ نوبجے تک پہنچ جائے۔ درینہ کرنا۔ خدا حافظ۔ اور دیکھو مرزا میرے تھوڑے سے روپوں کو بھی زیادہ سمجھنا۔ خدا حافظ۔ اور تمحارا بہت شکریہ۔ میں تمحارا بہت ممنون ہوں۔ اور میری گتنا خی کو معاف کر دینا، دیکھو نا کبھی کبھی یوں ہی بتے تکفی میں۔ کل صح آٹھ نوبجے تک۔ ضرور۔ خدا حافظ۔“

مرزا کہنے لگے ”ہاں ہاں، وہ سب کچھ ہو جائے گا۔“

رات کو بستر پر لیٹا تو بائیکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام تجویز کرتا رہا۔ یہ ارادہ تو پختہ کر لیا کہ دو تین دن کے اندر اندر اور دگر دی کی تمام مشہور تاریخی عمارت اور گھنٹوں کو نئے سرے سے دیکھو ڈالوں گا اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہوسکا تو بائیکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کروں گا صح ہوا خوری کے لیے ہر روز نہتر تک جایا کروں گا اور شام کو ٹھنڈی سڑک پر جب اور لوگ سیر کو ٹکلیں گے، میں بھی سڑک کی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک گیند کی طرح گزر جاؤں گا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی جب بائیکل کے چکیلے حصوں پر پڑے گی تو بائیکل جگہا اٹھے گی اور ایسا معلوم ہو گا کہ جیسے ایک راج ہس زمین کے ساتھ ساتھ اڑ رہا ہو وہ مسکراہٹ جس کا ذکر کر چکا ہوں ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی، بارہا دل چاہا کہ بھاگ کر جاؤں۔ اور اسی وقت مرزا کو گلے سے لگا لوں۔ رات کو خواب میں دعا نہیں مانگتا رہا کہ خدا یا مرزا بائیکل دینے پر

رضامند ہو جائے۔ صحیح اٹھتے ہی نوکر نے خوشخبری سنائی کہ حضور، وہ بائیکل آگئی ہے۔

میں نے کہا ”اتنے سورے؟“

نوکر نے کہا ”وہ تورات ہی آگئی تھی۔ آپ سو گئے تھے، میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی ڈبریاں کرنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔“

میں حیران ہوا کہ مرزا صاحب نے بائیکل بھجوانے میں اتنی عجلت کیوں کی۔ لیکن اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی نہایت شریف اور دیانت دار ہیں، روپے لے لیے تھے تو سائیکل کیوں روک رکھتے۔

نوکر سے کہا ”دیکھو یہ اوزار میں چھوڑ جاؤ اور دیکھو، بائیکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑ لو اور یہ موڑ پر جو بائیکل والا بیٹھتا ہے اس سے جا کر بائیکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ اور دیکھو ابے بھاگا کہاں جاتا ہے، ہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں۔ بائیکل والے سے تیل کی ایک کمی بھی لے آنا اور جہاں جہاں تیل دینے کی جگہ ہے وہاں تیل دے دینا اور کہنا کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دیدے جس سے تمام پرزے خراب ہو جائیں، بائیکل کے پُرے نازک ہوتے ہیں اور بائیکل باہر نکال کر رکھو۔ ہم ابھی کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ہم ذرا سیر کو جارہے ہیں اور دیکھو صاف کرو دینا اور بہت زور زور سے کپڑا بھی نہ رگڑنا بائیکل کا پاش گھس جاتا ہے۔ ذرا جلدی جلدی چائے پی، غسل خانے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ، ”چل چنبلی باغ میں“ گاتا رہا۔ اس کے بعد کپڑے بدلتے، اوزار کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔ برآمدے میں آیا تو ایک عجیب و غریب مشین پر نظر پڑی، ٹھیک طرح بیچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے۔ نوکر سے دریافت کیا ”کیوں بے! یہ کیا چیز ہے؟“

نوکر بولا ”حضور یہ بائیکل ہے۔“

میں نے کہا ”بائیکل! کس کی بائیکل؟“

کہنے لگا ”مرزا صاحب نے آپ کے لیے بھجوائی ہے۔“

میں نے کہا ”اور جو سائیکل رات کو انھوں نے بھجوائی تھی وہ کہاں گئی؟“

کہنے لگا ”یہی تو ہے۔“

میں نے کہا ”کیا بلتا ہے جو بائیکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی وہ بائیکل یہی ہے؟“

کہنے لگا ”جی ہاں۔“

میں نے کہا ”اچھا۔“ اور پھر اسے دیکھنے لگا۔

”اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟“

”حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے۔“

”تو یہ میلی کیوں ہے؟“

نوکرنے اس کا جواب دینا شاید مناسب خیال نہ کیا۔

”اور تیل لایا؟“

”ہاں حضور لایا ہوں۔“

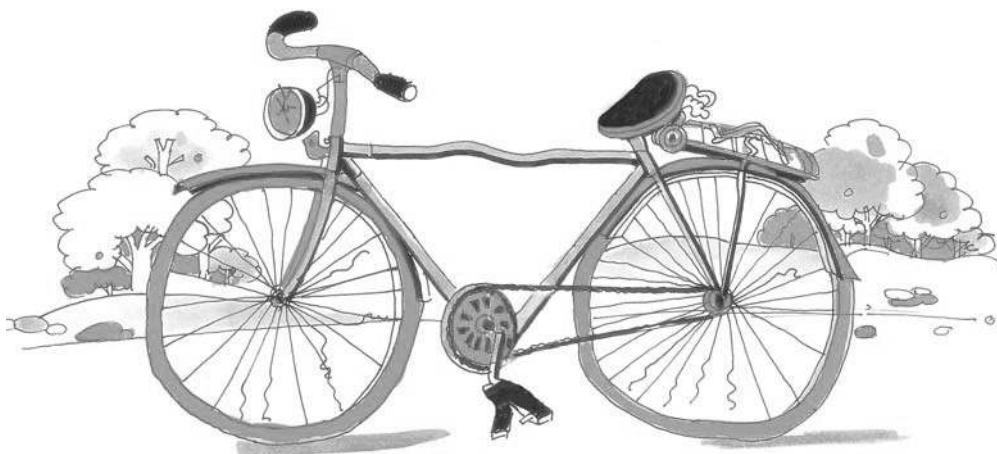
”دیا؟“

”حضور وہ تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں، وہ نہیں ملتے۔“

”کیا وجہ۔؟“

”حضور دھروں میں میل اور زنگ جما ہے، وہ سوراخ کہیں بیچ میں ہی دب دیا گئے ہیں۔“

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا جس کو میرا نوکر بائیکل بتا رہا تھا، اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا تو اتنا ثابت ہو گیا کہ بائیکل ہے، لیکن محمل ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ مل، رہٹ، چھڑا اور اسی طرح کی جدید ابجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پھر پیسے کو گھما گھما کر سوراخ تلاش کیا جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا لیکن اب اس سوراخ میں سلسلہ آمد و رفت بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا۔



”حضور وہ تیل تو سب ادھر ادھر بہ جاتا ہے، نیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔“

میں نے کہا، ”اچھا اوپر ہی اوپر ڈال دو، یہ بھی مفید ہوتا ہے۔“

آخر کار بائیکل پر سوار ہوا، پہلا ہی پاؤں چلایا تو معلوم ہوا کہ جیسے کوئی مردہ ہڈیاں چٹخا چٹخا کراپی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہو۔ گھر سے نکتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی، اس پر بائیکل خود بخود چلنے لگی لیکن اس رفتار سے کہ جیسے تارکوں زمین پر بہتا ہے اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونا شروع ہوئیں۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ چیں چا، چوں کی قسم کی آوازیں زیادہ تر گذی کے نیچ اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں..... کھٹ، کھڑ، کھڑ کھڑ کے قبیل کی آوازیں ٹمگارڈوں سے آتی تھیں۔ چ، چرخ، چ، چرخ قسم کے سُر زنجیر اور پیڈل سے نکلتے تھے۔ زنجیر ڈھیلی ڈھالی تھی۔ جب کبھی میں پیڈل پر زور ڈالتا تھا زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہو جاتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑچڑ بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیا گھونمنے کے علاوہ جھومتا تھا۔ یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا اور اس کے علاوہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو بھی نشان بن جاتا تھا۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی محور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ ٹمگارڈ تھے تو سہی، لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے، ان کی مدد سے صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو تو ٹمگارڈوں کی بدولت نائز ڈھوپ سے بچے رہیں گے۔

اگلے پہیے کے نائز میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا، جس کی وجہ سے پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ قدرے زمین سے اوپر کو اٹھ جاتا تھا اور میرا سر پیچھے کو یوں جھکتے کھارا تھا جیسے کوئی متواتر تھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو، پچھلے اور اگلے پہیے کو ملا کر چوں چوں، پھٹ پھٹ، چوں چوں کی صدائیں نکل رہی تھیں۔ جب اُتار پر سائیکل ذرا تیز ہوئی تو نضا میں ایک بھونچاں سا آگیا اور بائیکل کے کئی اور پر زے جواب تک سور ہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ ادھر ادھر کے لوگ چونکے، ماں نے اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیا۔ کھڑ کھڑ کے نیچ میں پہیوں کی آواز جسد استانی دے رہی تھی لیکن چوں کہ بائیکل اب پہلے سے تیز تھی اس لیے چوں چوں پھٹ پھٹ، چوں چوں پھٹ پھٹ کی آواز نے اب چوں پھٹ چوں پھٹ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دُھرا رہی تھی۔

اس قدر تیز رفتاری بائیکل کی طبع نازک پر گراں گزری، چنانچہ اس میں یک لخت دو تبدیلیاں واقع ہو گئیں۔ ایک تو پہنڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جاتا تو سامنے کو رہا تھا لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیکل کی گذی دفتار چھانچ کے قریب نیچے کو بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پہنڈل چلانے کے لیے میں ٹائیکیں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میرے گھٹنے تھوڑی

تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دوہری ہو کر باہر نکلی ہوئی تھی اور ساتھ ہی اگلے پہیوں کی ٹھکھیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھکلے کھا رہا تھا۔ گدی کا نیچا ہونا از حد تکلیف دہ ثابت ہوا، اس لیے میں نے مناسب بھی سمجھا کہ اس کوٹھیک کرلوں، چنانچہ میں نے بائیکل کو ٹھہرالیا اور نیچے اترा۔ بائیکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں خاموشی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل اٹیشن سے باہر آیا ہوں۔ جیب کے اندر سے میں نے اوزار نکالا۔ گدی کو اونچا کیا کچھ ہینڈل کوٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہو گیا۔

دس قدم بھی نہ چلنے پایا تھا کہ ہینڈل یک لخت نیچا ہو گیا، اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھراو نہیں تھی، میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا، تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھتے تھے اور برابر جھکلے کھا رہا تھا۔ آپ میری حالت کا صور کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو، مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو نکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میں بھر پہلے ہی مڑھ کر دیکھنے لگتا تھا لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کے لیے میری حالت ضیافت طبع کا باعث نہ ہو۔ ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا، تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی پھر نیچی ہو گئی اور میں ہمتوں زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک بڑ کے نے کہا ”دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے؟“ گویا اس بد تیز کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔ میں نے اتر کر پھر ہینڈل اور گدی کو اونچا کیا۔

لیکن تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا۔ وہ لمحے جن کے دوران میں میرے ہاتھ اور میرے جسم دونوں



برا بر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں بہت ہی کم تھے اور ان میں بھی میں یہی سوچتا رہتا تھا کہ اب کے گذی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل؟

چنانچہ نذر ہو کرنے بیٹھتا بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اور ہی رکھتا، لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہو جاتا۔

جب دو میل گزر گئے اور بائیکل کی اٹھک بیٹھک نے ایک مقرر باقاعدگی اختیار کر لی تو میں نے فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوالیے چاہیں، چنانچہ بائیکل کو ایک دکان پر لے گیا۔

بائیکل کی کھڑکھڑ سے جتنے لوگ کام کر رہے تھے سب کے سب اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے، لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا، ”ذرا اس کی مرمت کر دیجیے۔“

ایک مستری آگے بڑھا، لوہے کی سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اُس نے مختلف حصوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ٹھوک بجا کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا، اُس نے بڑی تیزی سے حالات کا اندازہ لگایا ہے، لیکن پھر بھی مجھ سے پوچھنے لگا ”کس کس پر زے کی مرمت کرائیے گا۔“

میں نے کہا۔ ”بڑے گستاخ ہوتم، دیکھتے نہیں کہ صرف ہینڈل اور گذی کو اونچا کرو کے کسوانا ہے، بس اور کیا؟ ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کر دو اور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟“

مستری کہنے لگا۔ ”مگر ڈبھی ٹھیک نہ کر دوں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں وہ بھی ٹھیک کر دو۔“

کہنے لگا۔ ”اگر باقی چیزیں بھی ٹھیک کرالو تو اچھا ہے۔“

میں نے کہا ”اچھا کر دو۔“

بولا ”یوں تھوڑا ہی ہو سکتا ہے، دس پندرہ دن کا کام ہے۔ آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔“

”اور پیسے کتنے ہوں گے؟“

کہنے لگا۔ ”بس تیس چالیس روپے لگیں گے۔“

میں نے کہا ”بس جی، جو کام تم سے کہا ہے وہ کر دو اور باقی ہمارے معاملات میں خل مت دو۔“

تھوڑی دیر میں ہینڈل اور گذی پھر اوپنی کر کے کس دی گئی، میں چلنے لگا تو مستری نے کہا ”میں نے تو کس دیا ہے لیکن یقین

سب گھسے ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں سب ڈھیل پڑ جائیں گے۔“

میں نے کہا ”بدتمیز کہیں کا۔ دو آنے مفت میں لے لیے۔“

بولا ”جناب آپ کو یہ بائیکل بھی مفت میں ملی ہوگی، آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟“ لکو یہ وہی بائیکل ہے جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے، پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں گزر کیں لیکن اس بائیکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔“

میں نے کہا ”واہ مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کانچ آیا جایا کرتے تھے۔ ان کو بھی کانچ چھوڑے ہوئے دو سال بھی نہیں ہوئے۔“

مستری نے کہا ”ہاں وہ توٹھیک ہے لیکن مرزا صاحب خود جب کانچ میں پڑھتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی سائیکل تھی۔“ میری طبیعت یہ سن کر کچھ مردہ سی ہو گئی۔ میں بائیکل کو ساتھ لیے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا، لیکن پیدل چنان بھی مشکل تھا۔ اس بائیکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑتا تھا جو عام بائیکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے۔ اس لیے ٹانگوں، کندھوں، کمر اور بازوؤں میں اس قدر درد ہو رہا تھا جو برداشت کے قابل نہ تھا۔ مرزا کا خیال رہ کر آتا تھا، لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اس کو دل سے ہٹا دیتا تھا، ورنہ میں پاگل ہو جاتا اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ متعین کرتا جس میں مرزا کی مختاری، بے ایمانی اور دغناکی پر ایک طویل تقریر کرتا۔ گل بنی نوع انسان اور آئندہ آئے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک نظرت سے آگاہ کر دیتا اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مرجاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیکل کو اونے پوئے نے فتح کر جو وصول ہوا سی پر صبر و شکر کروں۔ بلا سے دل پندرہ روپے کا خسارہ ہی سہی چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیکلوں کی ایک دکان آئی، وہاں ٹھہر گیا۔ دکان دار بڑھ کر میرے پاس آیا، لیکن میری زبان کو جیسے قفل لگ گیا تھا۔ عمر بھر کبھی کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی، مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں، آخر بڑے سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا لکا کہ ”یہ بائیکل ہے۔“

دکان دار کہنے لگا ”پھر؟“

میں نے کہا ”لوگے؟“

کہنے لگا ”کیا مطلب؟“

میں نے کہا ”بیچتے میں ہم۔“

دکان دار نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا جیسے مجھ پر چوری کا شبهہ کر رہا ہے۔ پھر بائیکل کو دیکھا۔ پھر

مجھے دیکھا۔ پھر بائیکل کو دیکھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آدمی کون سا ہے اور بائیکل کون سی ہے، آخر کار بولا:

”کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کرے؟“

ایسے سوالات کا جواب خدا جانے کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا ”کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے ان کا

مصرف کیا ہو گا؟“

کہنے لگا ”وہ تو ٹھیک ہے، مگر کوئی اس کو لے کر کیا کرے گا۔“

میں نے کہا ”اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا؟“

کہنے لگا ”اچھا چڑھ گیا پھر۔؟“

میں نے کہا ”پھر کیا؟ پھر چلائے گا اور کیا؟“

دکان دار بولا ”اچھا، ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا، یہ بائیکل کہنے آئی ہے۔“

جن حضرت کا نام خدا بخش تھا، انہوں نے بائیکل کو دور ہی سے دیکھا، جیسے یوسوںگر ہے ہوں۔

اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ جن کا نام خدا بخش نہیں تھا، میرے پاس آئے اور کہنے لگے ”تو آپ

چچ بیچ رہے ہیں؟“

میں نے کہا ”تو اور کیا۔ محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لیے میں گھر سے یہ بہانہ گھٹ کر لایا تھا؟“

کہنے لگا ”تو کیا لیں گے آپ؟“

میں نے کہا ”تم ہی بتاؤ؟“

کہنے لگا ”چچ بتاؤ؟“

میں نے کہا ”ہاں۔“

پھر کہنے لگا ”چچ بتاؤ؟“

میں نے کہا ”اب بتاؤ گے بھی یا یونہی ترساتے رہو گے۔“

کہنے لگا ”تین روپے دوں گا اس کے۔“

میرا خون کھول اٹھا اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کا ٹپنے لگے۔ میں نے کہا۔

”اوَصَعْتَ وَحْرَفَتْ سَعْيَتْ پَيْثَتْ پَالَنَّيْ وَالَّنَّيْ اَنْسَانَ! مجھے اپنی توہین کی پروانہیں، لیکن تو نے اپنی یہودہ گفتاری سے اس

بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے اس کے لیے میں تجھے قیامت تک معاف نہیں کر سکتا۔“ یہ کہہ کر میں بائیکل پر سوار ہو گیا اور اندر حادثہ پاؤں چلانے لگا۔

مشکل سے بیس قدم گیا ہوں گا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زمین یک لخت اچھل کر مجھ سے آگی اور آسان میرے سر پر سے ہٹ کر ٹانگوں کے پیچ میں سے گزر گیا اور ادھراً دھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بدل لی ہے۔ جب حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا کہ میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں گویا بڑی مدت سے مجھے جس بات کا شوق تھا آج پورا ہو گیا۔ اردو گرد کچھ لوگ جمع تھے، جن میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دکان تھی جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت و شنید کا سلسہ منقطع کیا تھا۔ میں نے اپنے گرد و پیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیکل کا اگلا پہیا بالکل الگ ہو کر لٹھتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا ہے اور باقی سائیکل میرے پاس پڑی ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا، جو پہیا الگ ہو گیا تھا اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا، دوسرے ہاتھ میں باقی ماندہ سائیکل کو تھاما اور چل کھڑا ہوا۔ محض ایک اضطراری حرکت تھی ورنہ وہ بائیکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی کہ میں اس حالت میں ساتھ ساتھ لیے پھرتا۔

جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چل دیا تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا ”یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ تمھارا ارادہ کیا ہے؟ یہ دوپیے کا ہے کوئے جا رہے ہو؟“

سب سوالوں کا جواب یہی ملا کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو سب لوگ تمھیں دیکھ رہے ہیں۔ سرو اونچار کھو اور چلتے جاؤ، جو نہیں رہے ہیں انھیں بہنے دو۔ اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں، آخر ہوا کیا۔ محض ایک حادثہ، بس دائیں بائیں مت دیکھو، چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشائستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے، ایک آواز آئی ”بس حضرت غصہ تھوک ڈالیے۔“ ایک دوسرے صاحب بولے ”بے حیا بائیکل گھر پہنچ کر تجھے مزہ چکھاؤں گا۔“ ایک بزرگوار اپنے لخت جگر کی انگلی پکڑے جا رہے تھے، میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگے ”دیکھو میٹا یہ سرس کی بائیکل ہے۔ اس کے دونوں پیسے علاحدہ ہوتے ہیں،“ لیکن میں چلتا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عزیمت پائی جاتی تھی۔ میرا دل جو کئی گھنٹوں سے ایک کش کش میں بتلا تھا، تیچ و تاب کھارہ تھا اب بہت ہلاکا ہو گیا تھا، میں برابر چلتا گیا، حتیٰ کہ ایک دریا پر جا پہنچا۔ پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پرواہی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کٹکھتا یا مرزا بولے ”اندر آ جاؤ۔“

میں نے کہا ”آپ ذرا باہر تشریف لائیے، میں آپ جیسے خدار سیدہ بزرگ کے گھر میں ڈنگو کیے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں؟“  
مرزا صاحب باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار ان کی خدمت میں پیش کیا جو انہوں نے بائیکل کے ساتھ ہی منت میں  
مجھ کو عنایت فرمایا تھا اور کہا۔

”مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا تھیے، میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔“  
گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا جو میں نے ایف۔ اے کے کورس میں پڑھی تھی۔

(اطرس بخاری)

## مشق

### سوالات

- |  |  |
|--|--|
| اس سبق میں مرحوم کے کہا گیا ہے؟ .1                           |  |
| موڑ کو دیکھ کر مصنف کو کیا خیال آیا اور وہ کیا سوچنے لگا؟ .2 |  |
| مصنف نے بائیکل کو دریا میں کیوں چینک دیا؟ .3                 |  |
| گھر پہنچ کر مصنف نے کس کتاب کا مطالعہ کیا اور کیوں؟ .4       |  |